

مرزا اسداللہ خاں غالب



شمس بمن گرامی

پیش لفظ

از محشر عظمی

"غالب کی باتیں" میرے جواں سال دوست شمس بن گرامی کا ادبی اور فکری شاہکار ہے۔ ابتک غالب پر جتنی کتابیں لکھی گئی ہیں اُن میں وہ خصوصیت نہیں جو "غالب کی باتیں" میں نظر آتی ہیں۔ مضامین کا تنوع، اسلوب نگارش، وسعت فکر، جدتِ تخیل، مصنف کی انفرادی خوبیوں اور فطری صلاحیتوں کی واضح دلیل ہے۔ کتاب میں جو سب سے انوکھی بات دکھائی دیتی ہے وہ مضامین کے الگ الگ عنوانات ہیں، اور عنوانات بھی ایسے جن کی طرف عام ادیبوں اور نقادوں کی فکر و نظر بہت کم گئی ہے۔ اور اگر کسی نے کچھ لکھنا بھی چاہا تو اس کی طبیعت نے پوری طرح اس کا ساتھ نہ دیا۔ غالب کو سمجھنے اور اس کے کلام کو سمجھانے کا اگر کوئی دعویٰ کر سکتا ہے تو صرف مولانا حالی اور ڈاکٹر عبدالرحمٰن بجنوری۔ ان دو ادیبوں کے علاوہ ہندوستان میں کوئی تیسرا ادیب نظر نہیں آتا۔ جسے حقیقی معنوں میں "غالب شناس" کہا جاسکے۔

شمس نے جو کچھ لکھا اور جیسا کچھ لکھا ہے بہتر ہے اور عام سطح سے بلند ہو کر لکھا ہے اور ایسا ہونا بھی ضروری ہے۔ غالب کو سمجھ کر دوسروں کو سمجھانا کوئی آسان بات نہیں۔ غالب کی شخصیت اپنی فلسفیانہ خصوصیات کے لحاظ سے ایک معمہ ہے جس کا حل کرنا اور

عوام کے سامنے پیش کرنا انھیں ارباب فکر کا کام ہے جو ادیب اور شاعر ہونے کے ساتھ فلسفیانہ دقیقہ سنجیوں تک پہنچنے کی فطری صلاحیت بھی رکھتے ہوں اور ان کی زبان بھی شاعر اور نقاد کی زبان ہو۔ ان کے انداز نگارش میں بھی ادبی خصوصیات ہوں۔ شمس فکر کی وسعتوں میں بھی گم نظر آتا ہے اور اس کے قلم کی رنگینی اور شوخی بھی کچھ کم نہیں۔ البتہ چند شعر کی تشریح میں فکر و قلم نے تھیں دھوکہ کھایا ہے۔

غالب کے متعلق مشہور ہے وہ شرابی تھا۔ اور یہ بات اپنی جگہ پر بالکل درست ہی۔ اس کی غزل کے ہر شعر شراب میں بھیگے ہوئے نظر آتے ہیں۔ غالب کا مجموعہ کلام پڑھنے کے بعد کسی کو اس کے شعور اس کی انسانیت پر یقین نہیں آسکتا ہے۔ پھر ایسے شاعر بدمست کا دین وایمان ہی کیا۔ لیکن نہیں، فکر و نظر رکھنے والے ادیب اور نقاد کسی کی مدہوشی پر نہیں جاتے، کسی کی دیوانگی کو نہیں دیکھتے وہ تو پہلے اس کے حقیقی اور فطری کردار کو پرکھتے ہیں۔ الفاظ کے پردے میں چھپی ہوئی حقیقتوں کو تلاش کرتے ہیں۔ شمس نے بھی یہی راہ اختیار کی ہے۔ اور اس میں سوچ سمجھ کر قدم رکھا ہے "غالب راز دار ہستی" "غالب سرور کائنات کے حضور میں" "غالب اور تصور فنا" ایسے عنوانات ہیں جن سے مصنف کا تحقیقی ملکہ اور اس کی فکری کاوش کا صاف صاف پتہ چلتا ہے۔ عام ادیب اور نقاد آسان راستہ تلاش کرتے ہیں مگر شمس نے جان بوجھ کر بہت پیچیدہ اور مشکل راہ اختیار کی ہے اور تعریف کی بات تو یہ ہے، اسے اپنے لئے آسان بنا لیا ہے۔ شمس کی سب سے بڑی خصوصیت یہی ہے۔

شمس کے مضامین تنقیدی ہیں یا نہیں۔ مضامین کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ شمس غالب کا انتہائی عقیدت مند ہے اس نے جو کچھ لکھا ہے عقیدت کے جوش میں لکھ

سخن فہمی اور طرفداری میں فرق ہے۔ شمس طرفدار نہیں ایسی باتیں وہی ارباب کہہ سکتے ہیں جو تنقید برائے تنقید ہی تک محدود ہیں۔ ولیم ہنری ہڈسن نے اسٹڈی آف لٹریچر کے دیباچہ میں لکھا ہے:

"تنقیدی ادب وہ ادب ہے جو کسی ادب کے متعلق لکھا گیا ہو جس میں
خواہ ترجمانی کی کوشش کی گئی ہو خواہ تعریف کی۔"

فرانسیسی نقاد سینٹ بیو اپنی رائے ان الفاظ میں پیش کرتا ہے۔

"غور کرنا۔ دیکھنا۔ سمجھنا۔ اور سمجھانا بس اسی کا نام تنقید ہے۔"

یورپ کے دوسرے نقادان فن نے بھی قریب قریب تنقیدی ادب کی تعریف اسی طرح کی ہے لیکن حقیقی معنوں میں تنقید کلام کے معائب و محاسن کو پرکھنے ہی کا نام ہے اس بارے میں لوسی شیخ الیسوعی کا خیال پسندیدہ ہے۔ وہ کہتا ہے:

"اصطلاح میں تنقید کی تعریف یہ ہے کہ لٹریچر میں خواہ نظم ہو خواہ
نثر عمیق النظری سے کام لیا جائے تاکہ کلام کی عمدگیاں اور محاسن
معائب اور لغزشیں ظاہر ہو جائیں۔"

شمس کے مضامین میں غالب کے محاسن ہی اجاگر کیے گئے ہیں معائب کا اظہار نہیں کیا گیا ہے۔ تاہم ان مضامین کو تنقیدی کہا جا سکتا ہے۔ چارلس سوئزن کے اس نقطہ خیال کے مطابق "غالب کی باتیں" اعلیٰ تنقیدی کتاب ہو سکتی ہے۔

"نقاد محاسن کو پہچانے اور بعد ازاں اس بات کو دریافت کرے کہ خوبیاں کیا ہیں۔"

شمس نے یہی تو کیا ہے۔ غالب کی خوبیوں اور عمدگیوں کو پہچان کر دوسروں کو پہچنوانے کی

کوشش کی ہے۔

مضامین طنز و مزاح کا رنگ کہیں کہیں صاف جھلکتا ہے اور کہیں کہیں فلسفیانہ خیالات ادب اور سنجیدگی کے روپ میں ملتے ہیں۔ غالب کی شخصیت میں یہ دو باتیں بیک وقت جمع تھیں۔ شمسؔ کی غالب شناسی کی اس سے واضح دلیل اور کیا دی جا سکتی ہے۔ انداز بیان اور زبان کی سادگی و پرکاری شمسؔ کی ادبی اور تخلیقی صلاحیتوں کی آئینہ دار ہے۔

محشرؔ اعظمی

غالب

کبھی غالب کے متعلق لوگوں کا خیال تھا کہ یہ شاعر مہمل گو ہے۔ اور آج غالب کی وفات کے صرف نصف صدی بعد دنیا کے بہترین نقادانِ فن کی رائے ہے کہ غالب کے شعر کا لفظ لفظ معانی و مطالب کا ایک دریائے بیکراں ہے۔ اس کا ایک ایک شعر ایک ایسا سمندر ہے جس کی گہرائی تک پہنچنا انسانی دماغ کی مجال نہیں۔ اقبال جیسے بلند پایہ اور عالی مرتبہ شاعر جس کی دقیق نکتہ رسی اور مضمون آفرینی کا ایک عالم مداح ہے۔ اس کے قلم کو بھی صرف اتنا ہی کہنے پر اکتفا کرنا پڑا کہ

فکرِ انساں پر تری ہستی سے یہ روشن ہوا
ہے پرِ مرغِ تخیل کی رسائی تا کجا

اور اسی جگہ میں ایک بات اور کہہ دوں جو ہرگز مبالغہ نہیں، وہ یہ کہ دنیا جوں جوں ذہنی ارتقاء کی منزلوں سے گذرتی جائے گی غالب کے اشعار کا عمق ناقابل پیمائش ہوتا جائے گا۔ اور ہر دور کا انسان یہ کہنے پر مجبور ہو رہا ہے گا کہ غالب اپنے وقت سے بہت پہلے پیدا ہو چکا ہے۔

وقت کی چیز اور ابدی چیز میں یہی تو بہت بڑا فرق ہے کہ وقت کی چیز اپنے وقت کیساتھ پیدا ہوتی اور فنا ہو جاتی ہے۔ اور اس کے برعکس ابدی چیز کا ظہور جب بھی ہو اسے فنا نہیں۔ وہ لافانی ہے۔ اقبال کی نظم "اٹھو میری دنیا کے غریبوں کو جگا دو" کی قدر و منزلت اسی

وقت تک ہے جب تک دنیا میں غربت و مفلوک الحالی ہے۔ سرمایہ داری نظام کے آہنی پنجے میں مزدور اور کسان پسے جا رہے ہیں موجودہ سماج راکشش بن کر کروڑہا بندگانِ خدا کے خون چوس رہا ہے۔ لیکن دنیا اگر تغیر پذیر ہے تو اس مذموم اور بدترین نظام کو بھی ایک دن تبدیل ہونا ہی ہے۔ آثار پیدا ہو چکے ہیں اس فرسودہ نظام کا خاتمہ یقینی ہے۔

شاعر کہتا ہے۔ OLD ORDER CHANGETH YEILDING PLACE TO NEW

اس دن اقبال کی اس نظم کی کوئی وقعت نہ رہ جائے گی۔ اقبال کی بہت سی نظمیں عجائب گھروں میں بہ حفاظت تبرکاً رکھی تو جا سکتی ہیں مگر دنیا ان کے خریداروں سے خالی ہو گی۔

مگر وہ شاعری جس کا ماخذ ازل اور انتہا ابد ہو، ہر دور، ہر ملک اور ہر انسان کے دل کی دھڑکن بن کر رہتی ہے۔ غالب نے شاعری کی مگر انسانی زبان میں نہیں، اس کی زبان الہامی تھی۔ اس کے دریائے تفکر میں موجیں اٹھیں مگر برساتی ندیوں اور نالوں کی طرح نہیں، بحرالکاہل کی طرح، تو پھر یہ غیر ممکن تھا کہ جس عہد میں غالب نغمہ سنجیاں کر رہا ہو گا۔ اس کے نغموں سے کوئی لطف اندوز بھی ہوتا ہو۔ حکومت مغلیہ انحطاط پر تھی۔ سارا ہندستان ذہنی غلامی میں مبتلا تھا۔ مرغانِ چمن اپنی طاقتِ پرواز کھو چکے تھے۔ شاعری پابند رسم و رواج بن کر رہ گئی تھی۔ شعرائے کرام کمر کی باریکیاں، زلف کی درازی، مژگان کی تیر اندازی اور آنکھوں کی شمشیر زنی پر اپنی جانیں قربان کر رہے تھے۔ رعایت لفظی پر مرنا اور ہجر و وصل کے تخیلی احساسات سے لذت یاب ہونا ان کی فطرت، فطرت ثانیہ بن رہی تھی، ایسے دور میں بھلا غالب کے فلسفے کی داد کون دیتا؟

غالب نے ساز چھیڑا اور نغمے نے درد ناک صورت اختیار کرلی ٥ نہ تھا کچھ تو خدا تھا کچھ نہ ہوتا تو خدا ہوتا

یہ مصرع بجائے خود ایک مکمل دیوان ہے۔ یہ تفسیرِ حیات ہے۔ صرف انسان کی نہیں ساری کائنات کی۔ اس کی حقیقت اور کنہہ اگر سمجھنا ہو تو کسی ملا سے نہیں کسی مارکرٹ (Marxist) سے نہیں۔ آئنسٹن اور برٹرنڈ رسل سے نہیں بلکہ کسی ویدانتک اور خرقہ پوش صوفی سے پوچھو وہ تمہیں کہے گا یہ مرزا اسد اللہ خاں کے دماغ کی اپج نہیں۔ مرزا نوشہ کے انسانی ذہن کی پیداوار نہیں بلکہ یہ غالب کا مدھر بول ہے۔ یہ ایک حق ہے۔ وہ حق جسے بھگوان سری کرشن نے خدا کہا۔ ہاں یہ اسی حق کی آواز ہے۔ گیتا کی تعلیمات بھری پڑی ہیں صرف اسی ایک مصرع کی تفسیر میں   کاش ارجن ہوتا تو غالب کو ہیرے جواہرات میں تول کر اسے بھی بھگوان کرشن کے پہلو بہ پہلو بٹھا دیتا اور پھر ایک رادھا قیامت تک جھوم جھوم کر گاتی رہتی۔

ع ڈبویا مجھ کو ہونے نے نہ ہوتا میں تو کیا ہوتا

اگر پہلے مصرع پر کوئی مصرع لگایا جاتا تو اس شعر پر دولختی کا فتویٰ ضرور صادر ہو جاتا۔

مگر غالب کے اس دوسرے مصرع کو دیکھیے اور پھر دونوں کے ربط باہم پر غور کرتے ہوئے کہیے کہ غالب کی عالی ہمتی نے کس بحرِ ناپیدا کنار میں غواصی کی کہ ایسا درِ نایاب ہاتھ آگیا۔۔۔ ۔۔۔۔۔ یقیناً ہم اسے تائیدِ غیبی ہی کہیں گے۔ اور پھر فراق[1] گورکھپوری کے اس خیال کی تائید ہمیں مجبوراً کرنا ہی پڑے گی کہ ـــــ ہندوستان میں صرف دو کتابیں الہامی ہیں ویدِ مقدس اور دیوانِ غالب۔"

غالب کے عہد میں ایک شعر زبان زدِ عام تھا ـــــ ـــ ۔۔

[1] ۔ ڈاکٹر بجنوری کی کتاب محاسنِ کلامِ غالب اسی جملے سے شروع ہوتی ہے۔ لیکن جہاں تک میرا خیال ہے یہ نقرہ فراق گورکھپوری ہی نے کہا۔ ممکن ہے میری یادداشت دھوکا کھا رہی ہو۔ شمس

کلامِ میرؔ ہم سمجھے کلامِ مرزاؔ سمجھے
مگر ان کا کہا یہ آپ سمجھیں یا خدا سمجھے

دربار ظفرؔ کے شعرائے کرام نے طنزاً یہ شعر غالبؔ کو مخاطب کر کے پڑھا تھا۔ غالبؔ کو یقینی افسوس ہوا ہوگا۔ اس لئے نہیں کہ ان کے کلام کو لوگ سمجھ نہیں سکتے ہیں۔ بلکہ اس لئے کہ زمانے کو سمجھنے میں انھوں نے غلطی کی۔ وہ خود فرما چکے تھے ؎ اپنے پہ کر رہا ہوں قیاس اہلِ دہر کا ۔ مگر ان سے کون کہے کہ میاں غالبؔ اپنے پہ اہلِ دھر کا قیاس نہیں کیا جا سکتا۔ ہر انسان کے دماغ کی ساخت اور قوت اور اک الگ الگ ہوتی ہے۔ آپ کا زاویۂ نگاہ دوسروں کے زاویۂ نگاہ سے کیسے میل کھا سکتا ہے۔ آپ کی منزل اور غیروں کی منزل ایک تو نہیں۔ آپ تو فرماتے ہیں ؎

مسکن اک بلندی پر اور ہم بنا لیتے
کاش کے ادھر ہوتا عرش سے مکاں اپنا

اسے سمجھنے کے لئے پھر کسی غالبؔ ہی کو جنم لینا ہوگا .... اور پھر اس شعر کو ؎

نقش فریادی ہے کس کی شوخیٔ تحریر کا
کاغذی ہے پیرہن ہر پیکرِ تصویر کا

سمجھنے کے لئے کسی حالیؔ ہی کو دوبارہ اس جہانِ فانی میں آنا ہوگا۔

غالبؔ نے شاعری کی، دنیا کے لئے نہیں اپنے لئے۔ اس کا مخاطب کوئی غیر شخص نہیں خود اس کی ذات تھی، متاعِ دنیوی کا وہ فریفتہ نہیں۔ حیاتِ ظاہری کا وہ شیدا نہیں۔ اس نے اپنے آپ پر نگاہ کی تو دیکھا کہ ساری کائنات اس کی ہستی کے اندر قید ہے ؎

قطرہ میں دجلہ دکھائی نہ دے اور جزو میں کل ۔:۔ کھیل لڑکوں کا ہوا دیدۂ بینا نہ ہوا

اس نے اپنے آپ کو کونین کی تمثیل اور خالق کونین کا ایک جزو ــــ ناقابلِ تقسیم ــــ سمجھا۔ اس رندِ بلانوش کو دنیا کے مال و متاع، حرص و ہوا اور جاہ و منصب سے کیا غرض ہو سکتی ہے جس کے دل سے یہ آواز آ رہی ہو ؎

دل ہر قطرہ ہے سازِ انا البحر　　　　ہم اس کے ہیں ہمارا پوچھنا کیا

اسے دنیا کی نکتہ چینیاں کیا بگاڑ سکتی ہیں: ۔ دنیا اسے بھلا کہے یا برا۔ غالب جیسے قدح خوار کو اس کی کیا پروا! عوام اس کے شعر کی قدر کریں یا توہین، غالب جیسے مست پندار کو اس کی کیا غرض: غرض اور فکر تو اسے ہو جسے ستائش کی تمنا اور صلے کی پروا ہو۔ غالب کو صرف اپنا محبوب پیارا تھا اس لئے کہ ؎ اصل شہود و شاہد و مشہود ایک ہے۔ کی حقیقت اس پر واضح ہو چکی تھی۔ اس نے اپنے معشوق کو پا لیا تھا۔ اس کی نگاہیں اپنے محبوب کے رُخِ زیبا کی جلوہ پاشیاں دیکھ چکی تھیں۔ اسے دنیا کی صرف ایک چیز مرغوب تھی اور وہ تھی شراب۔ شراب اسے عزیز تھی اس لئے نہیں کہ شراب غمِ ہستی کا علاج ہے۔ بلکہ اس لئے کہ ؎

ہر بُن قطرہ بدریا ہے خوشا موجِ شراب

شراب نے اسے بدمست نہیں بنایا بلکہ اس کی عقل کو فرش سے اٹھا کر عرش پر بٹھا دیا۔ اس نے اسی شراب کی رہنمائی میں وہ وہ منزلیں طے کر لیں کہ اسے ہم ولی سمجھتے جو نہ بادہ خوار ہوتا لیکن ہزار شکر کہ اس بادہ خواری نے اس کی ذات پر ایسا پردہ ڈال رکھا ہے۔ جسے زمانے کے مضبوط ہاتھ ہی اٹھا سکیں تو اٹھا سکیں۔

غالب ہمہ اوست کے قایل تھے اور "انما الحیوٰۃ الدنیا الامتاع غرور" کے فلسفے کے زبردست حامی۔ اُردو کے معلی میں ان کے عقیدے کی جھلک نمودان کے

خطوط سے صاف نمایاں اور انکی شاعری کا جزو اعظم بھی یہی ہے وہ ایک ہی روح ہر جگہ اور شے میں کارفرما دیکھتے ہیں فرماتے ہیں ؎ از مہر تا بہ ذرہ دل و دل ہے آئینہ

طوطی کو شش جہت سے مقابل ہے آئینہ

جس دور میں غالب کی شاعری نے آنکھ کھولی وہ دور شعرائے دہلی و لکھنؤ کے مخصوص انداز کا دور تھا۔ انسان پر ماحول کا اثر ہونا بھی لازمی ہے مگر اعلیٰ انسان تو وہ ہے جو ماحول کو اپنے سانچے میں ڈھالے۔ شعرائے کرام کمر کی تلاش میں سرگرداں تھے۔ باریک سے باریک مضمون کی جستجو جاری تھی۔ غالب کے سیدھے سادے دل نے یہ سمجھا کہ عنقا کی طرح کمر بھی شاید شاعروں کی کوئی نئی اختراع ہے۔ لہٰذا تو ہے مگر وہ چیز نہیں۔ اس رند خرابات نے بھی شاعروں کی کمر پر ایک مضمون باندھا۔ مگر ای واہ طریقۂ گفتار تو دیکھئے سب سے نرالا، مضمون تو ملاحظہ ہو ساری دنیا کی شاعروں کی نظر اس طرف گئی بالکل اچھوتا، اور پھر زبان اور انداز: قربان جائیے فرماتے ہیں ؎ شاہد ہستی مطلق کی کمر ہے عالم لوگ کہتے ہیں کہ ہے پر ہمیں منظور نہیں

شاعروں کی کمر بھی آگئی اور غالب کا عقیدہ بھی، یہ عالم کیا ہے شاہدِ ہستی مطلق کی کمر۔ شاعر کہتے ہیں۔ کمر تو ایسی چیز ہے جو نظر نہیں آتی اور یہ عالم تو نظر آتا ہے غالب کہتے ہیں یہ تمہاری آنکھوں کا قصور ہے تمہاری آنکھوں پر پردہ پڑا ہوا ہے اس پردے کو اتار ڈالو حقیقت نظر آنے لگے گی تم لاکھ کہو کہ عالم ہے مگر میں ہرگز تسلیم نہیں کر سکتا ؎

ہستی کے مت فریب میں آجائیو اسد

عالم تمام حلقۂ دامِ خیال ہے

ناظرین! اس شعر کو آپ پڑھئے اور پھر ذرا آنکھیں بند کر لیجئے آپ کو ایسا محسوس ہوگا۔ شاید آکاش وانی ہو رہی ہے معلوم ہوگا بہت دور بہت بلندی سے کوئی آواز آرہی ہے ؎

ہستی کے مت فریب میں آجائیو اسدؔ — عالم تمام حلقۂ دامِ خیال ہے

اس شعر میں حلقۂ دامِ خیال کی ترکیب کی داد نہیں دی جا سکتی۔ یہ غالب ہی کا قلم تھا جو ایسی ایسی ترکیبیں گھڑ لیتا تھا۔ ورنہ اُردو زبان میں اتنی وسعت نہ تھی کہ غالب کے مضامین اس میں سما سکیں۔ مگر اس نے وہ وہ لفظ ایجاد کیے کہ اُردو زبان کافی وسیع ہو گئی۔ انگریزی اور فارسی اپنی وسعت پر ناز کرتی ہیں مگر اب زبانِ اُردو کے سامنے ـــــ اور وہ بھی صرف غالب کی بدولت ـــــ دوسری دوسری زبانیں سب ہیچ ہو گئیں۔ غالب نے غزل کے متعلق کہا تھا کہ ؎

کچھ اور چاہیے وسعت مری زباں کے لیے ـــــ مگر زبانِ اُردو کے متعلق اس نے بانگ دہل اعلان کیا ؎

کوئی کہے کہ ریختہ کیوں کہ ہو رشکِ فارسی — گفتۂ غالب ایک بار پڑھ کے اسے سنا کہ یوں

فریبِ ہستی کے مضمون کا ایک اور شعر یاد آ رہا ہے۔ بحر نہایت مختصر، زمین بالکل نئی ـــــ مگر ملاحظہ ہو سمندر کو غالب نے کوزے میں کس طرح بند کیا ؎

ہاں مت کھائیو فریبِ ہستی — ہر چند کہیں کہ ہے نہیں ہے

غالب کی شاعری کو معنوی لحاظ سے دو بڑے حصوں میں تقسیم کر سکتے ہیں ـــــ وہ اشعار جو ہمہ اوست کے فلسفہ پر روشنی ڈال رہے ہوں اور پھر وہ اشعار جو فریبِ ہستی کے عقدہ کشا ہوں۔ یہ دونوں تصور حقیقت میں ایک دوسرے کے تتمہ ہیں یعنی دونوں مل کر ایک فلسفہ کے حامل اور الگ الگ دو مختلف اور مستقل فلسفے۔ اس مضمون کے علاوہ اور بہت سے مضامین غالب کے دیوان میں ملیں گے۔ لیکن اگر تحقیقی نظر سے آپ ان اشعار پر غور کریں گے تو ان میں بھی آپ دیکھیں گے کہ غالب کا اپنا فلسفہ بول رہا ہے۔

غالب جس عقیدے کا ماننے والا تھا وہ خضر رہ راسخ ہوتے ہوتے ایمان کی حد تک پہنچ چکا تھا ——— اور پھر واقعی ایک دن غالب حیران ہو کر بول اٹھا۔

اصل شہود و شاہد و مشہود ایک ہے حیراں

شریعت معرفت سے ٹکرا گئی ——— یا معرفت نے شریعت کو بے حقیقت کر دیا؟ اس سوال کا جواب دینے جائیے تو پہلے اپنے آپ کو پھانسی کے لئے بھی تیار کر لیجئے۔ کیوں کہ دنیا نے ایک اصول قائم کر لیا ہے سہ چو حرف حق بلند شود دار می شود ——— وہ اپنے اصول سے سر مو تجاوز نہیں کر سکتی۔ آپ دہریہ ہو جائیں یہ دنیا برداشت کر سکتی ہے۔ آپ مشرک بن جائیں یہ اسے منظور ہے۔ مگر فطرت نے جو قوانین بنا دیئے ہیں۔ اسے توڑنے کی اگر ذرا بھی آپ نے آمادگی ظاہر کی تو پھر کسی کی تلوار ہوگی اور آپ کی گردن ——— تاریخ نے ایسے بہت سے واقعات اپنے دامن میں چھپا رکھے ہیں ——— تو پھر کیوں نہیں شراب کے جام پر جام پیتے رہیں تا کہ دنیا اس دھوکے میں تو پڑی رہے کہ یہ شخص نشے میں اول فول بک رہا ہے۔ سہ

بک رہا ہوں جنوں میں کیا کیا کچھ کچھ نہ سمجھے خدا کرے کوئی

ورنہ یہ جنت! یہ حور و غلماں! توبہ توبہ۔ کتنا فریب پھیلا رکھا ہے دنیا والوں نے۔ عبادت اور جنت کے لالچ پر! استغفراللہ۔ یہ تو صریح شرک ہے۔ عبادت اور دوزخ کے خوف سے! معاذاللہ۔ یہ تو شرک بالائے شرک ہے۔ عبادت کا مقصد تو صرف پیار تھا ہے ——— محبوب کی حمد و ثنا، اسی کی رضا جوئی ——— اس لئے غالب چلا اٹھا، کچھ اپنی غرض کے لئے نہیں بلکہ عبادت کی توہین دیکھ کر سہ

دوزخ میں ڈال دو کوئی لیکر بہشت کو

کیوں؟ اس لیے کہ :۔ طاعت میں تا رہے نہ مے و انگبیں کی لاگ

غالب کے کلام میں ایک زبردست خوبی اور امتیازی خصوصیت ہے جو اوروں کے کلام میں ہرگز نہیں۔ ہندوستان کے ٹیگور اور اقبال ہوں یا انگلینڈ کے ملٹن اور ٹینی سن جرمن کے گوئٹے ہوں یا ایران کے حافظ۔ ان شعرائے کرام کی نظمیں اور غزلیں پڑھئے۔ اگر آپ نے ان کے اشعار سمجھ لیے تو جو معنی آپ کی سمجھ میں آئے ہیں وہی معنی بڑے سے بڑا فلسفی، اور اعلیٰ سے اعلیٰ ویدانتک بھی لگائے گا۔ مگر غالب کے کلام میں یہ بات نہیں۔ اس کے کسی شعر کو آپ جو سمجھ رہے ہیں دوسرا ہرگز وہ نہیں سمجھ رہا ہوگا۔ آپ کچھ معنی لگائیے گا۔ دوسرے کچھ اور ہی معنی لگائیں گے۔ دیوانِ غالب پر میں نے متعدد شرحیں دیکھیں۔ مگر ہر شارح نے ایک دوسرے سے مختلف ہی معنی لگائے ہیں .... اور اخیر میں یہی فیصلہ کرنا پڑتا ہے کہ غالب کے اشعار کو ہم اسی حد تک سمجھ سکتے ہیں جس حد تک ہمارے ذہن کی رسائی ہوگی۔ غالب کے الہامی شاعر ہونے کے لئے اس سے بڑھ کر اور کیا ثبوت دیے جا سکتے ہیں۔

رازِ ہستی

دنیا کے ہر ازم نے خواہ وہ کمیونزم ہی کیوں نہ ہو، تخلیق کائنات کی کچھ نہ کچھ وجہ ضرور بیان کی ہے۔ کونین کی ماہیت اور اسکے کنہ کو جاننے کی کوشش جہاں تک اپنا خیال ہے تہذیب کی روشنی کے ساتھ ہی آئی۔ یہ عالم کیوں بنا اور پھر کیسے بنا؟ یہ ایک سوال ہے جسے حل کرنے کی سعی ہر مفکر نے کی۔ دنیا میں جتنے رشی، منی، پرافٹ اور پیغمبر آئے۔ سب نے اس پر کچھ نہ کچھ روشنی ضرور ڈالی ہے۔ مذہب نے ایک قادر مطلق کی ہستی تسلیم کر لینے کے بعد اس کائنات کو اسی کے ارادہ کا پرتو تسلیم کیا مگر سرزمین ہند نے اپنی آغوش میں ایک ایسے فرقے کو بھی پرورش کی جس نے تین چیزوں کو ازلی کہا۔ پرماتما، آتما، اور پرکرتی یعنی روح اعظم، روح اور مادہ۔ اس کے خیال کے مطابق پرماتما برہما نہیں بلکہ روح اور مادے کی آمیزش سے ایک گھروندا بنانے والا تماشا گر ہے اسکے تصور نے خدا کو خالق کل سمجھنے سے انکار تو کر دیا مگر دنیا کی موجودہ شکل و صورت کو اسکی محنتوں کا ثمرہ سمجھا اور یہی خاص وجہ ہے کہ اس فرقے کو مجبوراً آواگون یعنی مسئلہ تناسخ پر یقین کرنا پڑا۔ اس مذہب کے علاوہ دوسرے مذاہب نے پرماتما (روح اعظم) ہی کو سرب شکتی مان (قادر مطلق) کے روپ میں دیکھا اور اس کائنات کا خالق اسی کو تسلیم کیا۔ اس جماعت نے وجہ میں وجہ یہ پیش کی کہ ہر مفعول کا ایک فاعل ضرور ہے، ہر دائرے کا ایک مرکز ہونا لابدی ہے۔ اگر ایک ریڈیو کو دیکھکر ہم اس کے موجد کا تصور کر سکتے ہیں تو پھر کوئی وجہ نہیں کہ کائنات کا ذرہ ذرہ کسی خالق کی شہادت

نہ دے۔ دہریت نے ان دونوں تصوّرات سے اپنی بیزاری ظاہر کی۔ اس نے پرماتما، آتما نیز قادر مطلق کی ہستی سے انکار کر دیا۔ روحانیت کو اس نے مجذوب کی بڑ سمجھا۔ خدا کا تصوّر اس کی نظر میں ایک مذاق سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتا۔ اس کی نظر صرف مادے پر گئی اور دنیا کی موجودہ ہیئت کو اس نے مادے کی ارتقا سمجھا۔ ہاں اتنی بات اسے بھی طوعاً کرہاً ماننی پڑی کہ اس مادہ کے اندر ایک قوت (ENERGY) ضرور ہے اگرچہ وہ قوت صاحب اختیار نہیں مجبور محض ہے۔ مادہ ہی اپنی مختلف صورتیں تبدیل کرتا ہوا آج اس صورت میں جلوہ گر ہے اور انسان اسی مادے کی ارتقا کا ایک بہترین نمونہ ہے۔

اب ہمارے سامنے تینوں قسم کے لوگوں کے نظریے آ گئے۔

۱۔ ایک وہ فرقہ جو تین چیزوں کو ازلی سمجھتا ہے۔ پرماتما، آتما، اور مادہ۔

۲۔ دوسرا گروہ جو صرف مادہ ہی کو بشمول قوت مجبور محض ازلی سمجھتا ہے۔

۳۔ تیسری وہ جماعت جو صرف خدا کو ازلی سمجھتی ہے۔ مادہ جس کی نظر میں حادث

ہمیں اس سے بحث نہیں کہ ان تینوں میں کون صحیح راستے پر ہے اور کس نے غلط قدم اٹھایا ہے۔ مگر اتنی بات ضرور ہم عرض کریں گے کہ عقل عاجز نمبر ۱ کو صحیح مانتی ہے اور ظاہر بین نگاہ نمبر ۲ کو درست سمجھتی ہے۔ اور قلب سلیم نمبر ۳ پر جان چھڑکتی ہے۔ دنیا کے اس مذہب نے جس نے امن عامہ کا پیغام دیا اسی تصور نمبر ۳ کی علمبرداری کی۔

خدا کو ازلی سمجھ لینے کے بعد اس کی قدرت کاملہ پر یقین کرنا از بس ضروری ہو جاتا ہے اسلام نے اس کائنات کی تخلیق کے متعلق صرف اتنا کہا کہ ساری کائنات صرف ایک لفظ "کن" کا کرشمہ ہے۔ خدا کے ارادے میں جنبش ہوئی اور کائنات وجود میں آ گئی۔ اللہ نے کن کہا اور ساری چیزیں خود

بخود ہو گئیں۔ اب ایک بہت بڑا سوال سامنے نظر آجاتا ہے وہ یہ کہ مادی دنیا جو ہماری نظروں کے سامنے ہے اس کی ہستی خارج از خدا کوئی مستقل بالذات ہستی ہے یا ہم اور آپ جو کچھ دیکھ رہے ہیں وہ صرف لفظ کن کا کرشمہ ہے۔ اگر یہ مستقل بالذات کوئی ہستی ہے تو یہ ازلی ہو یا نہ ہو ابدی ضرور ہوگی۔ اسے حادث نہ ہونا چاہیے۔ اور اگر یہ صرف اللہ کے ارادے کی مختلف صورتیں ہیں تو مادہ خارج از ذہن کوئی چیز نہیں جس کا دوسرا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ جسے ہم مادہ سمجھ رہے ہیں۔ وہ حقیقت میں کوئی شئے نہیں۔ ایک وہم ہے جسے ہستی کائنات سمجھ لیا گیا ہے۔

اس جگہ آکر اسلام نے دو نظریوں کے حامیوں کو پیدا کیا ایک جماعت نے کہا ہمہ از دست۔ اور یہ اسلام کے فلسفیوں کی جماعت ہے اس جماعت نے اپنے دل سے زیادہ ذہن سے کام لیا۔ دوسری جماعت نے کہا ہمہ اوست اور یہ اسلام کے ان خرقہ پوشوں کی جماعت ہے جو عرف عام میں صوفیائے کرام کے نام سے مشہور ہوئی۔ یہ جماعت اپنے دل کو بروئے کار لائی اور اس نے ببانگ دہل اعلان کر دیا کہ قطرہ قطرہ شبنم ہی کیوں نہ ہو مگر ہے وہ سمندر ہی کا ایک جزو اور سے دل ہر قطرہ ہے ساز انا البحر۔ کی صدا فضائے بسیط میں گونج اٹھی۔ مگر اس اعلان نے ظاہر بینوں کی آتش غضب کو مشتعل کر ڈالا۔ اور یہ نظریہ جوں جوں مشہور ہوتا گیا اس کے حامیوں پر نئی نئی آفتیں آتی گئیں۔ اس نظریہ کے ماننے والوں نے ہزاروں مشکلیں برداشت کیں تختۂ مشق ستم بنے مگر پائے ثبات میں ایک ذرا لغزش نہ آئی۔ معلوم نہیں کتنے بے گناہوں نے اس اعلان پر اپنی جانیں نثار کر دیں۔

حضرت غالب اسی نظریے کے حامی تھے۔ ان کی نگاہ حق شناس جب کائنات پر گئی تو ان کا دل بول اٹھا۔ "کتنی جائے حیرت ہے کہ جو وہم ہے اسے عوام حقیقت سمجھ

رہے ہیں. حقیقت تو صرف اللہ کی ایک ذات ہی. اور ماسوا اس کے ساری چیزیں وہم میں الجھ کی جہالت پیران کا دل رو اٹھا. انا البحر کے ساز میں جنبش آئی ساز نے نغمے کی صورت اختیار کی. صوتِ سرمدی صفحۂ قرطاس پر شعر کی صورت میں اتر گئی۔ غالب گنگنا اٹھا. ساری کائنات وجد میں غالب کے سُر میں سُر ملا کر جھومنے لگی.

جز نام نہیں صورت عالم مجھے منظور

جز وہم نہیں ہستیٔ اشیا مرے آگے

نام بجز اس کے اور کیا ہے کہ ہم نے اپنی آسانی اور سہولت کے لئے تعارفی لفظ گھڑ لیا ہے. نام ملکشاف حقیقت نہیں، سنکھیا ایک زہر ہے لیکن اگر اس سنکھیا کو ہمارے مورث اعلیٰ شہد کہہ دیتے تو آج ہم آپ کہتے کہ بازار سے شہد لے آیئے. اور آپ پنسار کی دکان سے زہر کی ڈلیاں اٹھا لیتے. سورج کو چاند اور چاند کو سورج کہہ دیا جاتا تو آج ناموں سے ہم قطعی وہ چیز نہ سمجھتے جو آج سمجھ رہے ہیں۔ غالب کہتا ہے عالم کی مختلف صورتیں حقیقت میں کچھ نہیں. صرف ہم نے چند نام رکھ لئے ہیں۔ اور ان چیزوں کی ہستی بجز وہم کے اور کچھ نہیں. وہم اس چیز کو کہتے ہیں جس کا کوئی وجود نہیں اور ہم نے اپنی لاعلمی کی بنا پر اسے کچھ سمجھ لیا.

اس شعر کی حقیقت پر ہم غور کرتے ہیں تو ہمیں ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کوئی زبردست قوت ایک ایسی ہستی جو سرحد ادراک سے بھی پرے ہے وہ بذات خود غالب کے دل کو چھیڑ رہی ہے اور غالب مجبور ہے اس حقیقت کے اظہار کرنے پر. اس رند خراباتی نے سب کچھ تسلیم کیا اور کیا تو صرف ہستی اشیا کو.

غالب نے مخلوق سے خالق کی معرفت حاصل نہ کی. اس نے مفعول اور فاعل کے تصور پر وقت

ضائع نہ کیا بلکہ اس نے خلقت سے خالق کا اور شہود سے وجود بحر کا اقرار کیا۔ اس اقرار کا تعلق دلائل منطق سے نہیں بلکہ قلب سلیم کی پکار سے ہے۔ اگر اس رازدار ہستی کا ذہن بھی منطقی الجھنوں میں گرفتار ہوتا تو آج اسے ہم رومی منصور اور سرمد کی صف میں نہیں دیکھتے بلکہ اس کا مقام رازی اور غزالی کے پہلو بہ پہلو ہوتا۔ اس میکش عارف نے کونین کے ہر ذرے کو ایک دل سمجھا ہر دل کو عرش اعظم۔ یہ عرش وہ عرش نہیں جسے مان کر ہم خدا کی تجسیم کے قائل ہو جاتے ہیں بلکہ یہ وہ عرش ہے جو بذات خود وہی ہے۔

غالب نے صورت عالم کو جز نام اور کوئی شے منظور تو نہ کیا۔ مگر اس کی بشریت پریشان ہو گئی اس کے دل میں ہزاروں قسم کی الجھنیں سما گئیں۔ متعدد سوالات ذہن میں آنے لگے۔ اس نے جب خدا کے ماسوا کسی چیز کا وجود ہی تسلیم نہ کیا تو پھر نگاہیں ان مادی اشیاء سے کیوں ٹکرا جاتی ہیں؟ غالب نے اپنے محبوب کو مخاطب کیا۔ مگر اس انداز سے گویا ایک حقیقت طلب مسافر اپنے دائیں بائیں آگے پیچھے، اوپر نیچے اشیائے رنگا رنگ اور نیرنگی ہستی عالم کو دیکھ کر اپنے راہبر سے پوچھتا ہو۔ مگر سوال کو اس نے غزل کی شیریں زبان دے دی ہے

جب کہ تجھ بن کوئی نہیں موجود — پھر یہ ہنگامہ اے خدا کیا ہے؟
یہ پری چہرہ لوگ کیسے ہیں — غمزہ و عشوہ و ادا کیا ہے؟
شکن زلف عنبریں کیوں ہے — نگہ چشم سرمہ سا کیا ہے؟
سبزہ و گل کہاں سے آئے ہیں
ابر کیا چیز ہے ہوا کیا ہے؟

یہ چند سوالات ہیں جنھیں غالب کی بیتاب نگاہوں نے دیکھا اور بیقرار دل نے پوچھا۔

اور پوچھنے کی وجہ صرف یہ پیدا ہوگئی ہے کہ غالب اپنے نظریئے سے سرمو تجاوز کرنا نہیں چاہتا

اور وہ یہ کہ جب کہ تجھ بن کوئی نہیں موجود۔

غالب کے دل میں یہ سوالات ٹکراتے رہے۔ اس کی پریشانیاں بڑھتی گئیں۔ آخر ایک دن

شراب کے ایک جام نے اس کی ساری گتھیاں سلجھا دیں۔ حقیقت آئینے کیطرح صاف ہو گئی

یقینی اس کا محبوب اس کے دل کے اندر بول اٹھا۔ اس جواب نے خلقت کے منتشر اجزا کو ایک

سلک میں پرو کر دکھا دیا آواز سرمدی نے کہا کائنات کی کسی چیز پر اگر بے سلسلہ نگاہ ڈالی

جائیگی تو دل کے اندر ایسی ہی تنم کے توہمات پیدا ہوتے رہیں گے۔ لیکن اگر ساری کائنات کو

ایک کل مان کر دیکھا جائے تو پھر اس نشیب و فراز کے جھگڑے چک جاتے ہیں۔ راہبر نے

غالب کی طرف منہ پھیر کر دیکھا اور کہا

نہو بہرزہ بیاباں نورد وہم وجود

ہنوز تیرے تصور میں ہیں نشیب و فراز

میاں غالب وہم وجود کی بیاباں نوردی خواہ مخواہ نہ کرو۔ لاموجود الا اللہ یہ ایک حق ہے۔

اور پھر اس رضا و تسلیم کے پیکر نے سر تسلیم خم کر دیا۔ اس کی زبان نے دنیا والوں کو بالاعلان کہہ

دیا

ہاں کھائیو مت فریب ہستی

ہر چند کہیں کہ ہے نہیں ہے

اور پھر غالب کے دل نے بیساختہ تصدیق کر دی

ہستی ہے نہ عدم ہے غالب

غالب نے اپنی اس تھیوری (Theory) کے ثبوت میں کہ یہ کائنات حقیقت

ہیں لفظ 'کن' ہی کی دوسری شکل ہے۔ اشیاء عالم کی ظاہری صورتوں پر خامہ فرسائی کی ہے۔ مادہ جسے ہم فنا پذیر سمجھتے ہیں وہ دراصل فنا ہی کا ایک روپ ہے۔ مگر ہماری نظریں اس کے وجود سے اس لئے دھوکا کھا جاتی ہیں کہ ہم پر بھی خود اسی فنا یعنی مادے کا غلاف چڑھا ہوا ہے۔ اور یہ غلاف جب خود بخود ناپید ہو جاتا ہے یعنی ہماری نگاہیں جب اس غلاف کو نہیں دیکھتیں تب حقیقت کا انکشاف ہوتا ہے مگر یہ وقت عام انسانوں پر اس وقت آتا ہے جب وہ قیدِ حیات سے نجات پا لیتے ہیں۔ جب ایک انسان مادی لوازمات سے کنارہ کش ہو جاتا ہے تب اس پر یہ راز کھلتا ہے کہ وہم آخر وہم نکلا۔ مگر ان خواص کا طبقہ جو موت سے پہلے مرجاتے ہیں۔ وہ ہمیشہ ہی محسوس کرتے رہتے ہیں کہ قطرہ اور بحر کا امتیاز محض نام کو ہے ورنہ قطرے کا وجود بحر سے خارج کوئی علیٰحدہ وجود نہیں۔ یہ حضرات ساری کائنات میں ایک ہی نور جلوہ گر دیکھتے ہیں۔ ایک ہی رُوح ہے جو حقیر ترین ذرّے سے لیکر بڑے سے بڑے سیارے کے اندر کار فرما ہے۔ کل کے جس جزو پر بھی ہم نگاہ ڈالیں وہ کل سے علیٰحدہ نہیں اور یہ جو ظاہری لباس کونین نے اوڑھ لیا ہے۔ یہ جب وہم ہی ٹھہرا تو پھر انکشاف وہم کی مدت ہی کیا؟ ابھی آنکھ بند ہوئی اور ابھی اظہار حقیقت ہو گیا۔

یک نظر بیش نہیں فرصت ہستی غافل
گرمیٔ بزم ہے اک رقص شرر ہونے تک

اسی نکتہ دان فطرت نے جس طرح مشاہدہ حق کی گفتگو کے لئے لوازمات دینوی ہی کا انتخاب کیا۔ اسی طرح اپنے نظریئے کے ثبوت کے لئے بھی انہیں چیزوں کو چن لیا جس کی تمثیل ارباب ذوق کے خیالات کو جلد از جلد مرکز کی طرف موڑ دے۔ اس نے قطرہ و موج و حباب کی طرف ذہن

مبزدل گرا کر وجود بحر کی دلیل پیش کی۔ ذرا اس شعر کو پڑھیئے اور خدا لگتی کہیئے۔ اس نبض شناس نے کیسی پتے کی بات کہدی ہے

ہے مشتمل نمودِ صور پر وجودِ بحر
یاں کیا دھرا ہے قطرہ و موج و حباب میں

ہمارے اندر جو جان ہے اگر یہ خارجی کوئی شئے ہے تو یقیناً اسے بھی فنا ہو جانا چاہیئے۔ مگر یہ جان بجز اپنے رب کے امر کے اور کیا ہے۔ ہاں فرداً فرداً ہر شخص بھی از مہر تا بہ ذرہ اپنے کل کے اندر ہے۔ صورتیں مختلف ہیں مگر روح وہی ایک ہے۔ نام میں اختلاف ضرور ہے مگر سب کے دل میں ساز ایک ہی بج رہا ہے۔ اس ہستی کائنات کی مثال ایسی ہے کہ ایک آئینہ خانہ ہو جس میں ایک طوطی بیٹھا ہوا ہو۔ ہر آئینے میں وہی ایک طوطی زبان کھولے نغمہ سرائی کر رہا ہے۔ اب اگر کوئی آئینہ یہ کہے کہ یہ نغمہ جس کی دلکش آواز فضا میں رس گھول رہی ہے وہ میری آواز ہے تو اس کا یہ دعویٰ محض اس کے وہم کی دلیل ہے۔ وہ ایک بہت بڑی غلطی میں مبتلا ہے۔ تصور نے ایک فرضی آئینہ خانہ گھڑ رکھا ہے۔ تو اس کی ہر چیز ہی فرضی ہوگی۔ اور یہ فرضی چیز صرف مان لینے کو کہتے ہیں۔ ورنہ اس کا وجود کیا اور اس کی حقیقت کیا۔

غالب نے جب اپنے آپ پر نظر کی تو اس نے اپنے آپ کو عدم سے بھی پرے پایا۔ اور اور عدم سے پرے بجز ذاتِ واحد کے اور کیا ہے۔ آہ! یہ دنیا کتنی ٹھوکریں کھاتی ہے۔ کاش غالب کا فلسفہ عام ہو کر ہر فرد بشر کے دل میں جاگزیں ہو جاتا تو آج اہلِ دنیا کو یہ روز بد دیکھنا نہ پڑتا۔ کس سلجھے ہوئے لفظوں میں غالب دنیا کے غافلوں کو مخاطب کر کے کہتا ہے ہاں اپنے انداز بیان کو اس نے شاعری کا جامہ ضرور پہنا دیا ہے

ہیں عدم سے بھی پرے ہوں ورنہ غافل بارہا
میری آہ آتشیں سے بال عنقا جل گیا

عنقا ایک فرضی چڑیا ہے جو صرف شاعروں کے دیوانوں ہی میں نظر آتی ہے. سرے سے اس اختراع لفظی کا وجود ہی نہیں تو پھر عنقا کیا اور بال عنقا کا تصور کیا. مگر غالب کہتا ہے. اگر تم ہماری ہستی کے قایل ہو تو ہماری آہ آتشیں کی ایک ادنیٰ کرامت بھی سن لو. وہ یہ کہ جب ہم اس ہستی میں تھے جسے تم نے ہستی کا نام دے رکھا ہے. اس وقت ہماری آہ آتشیں سے بارہا عنقا کے پر جل گئے. لیکن اب ہم تمہاری ہستی سے نکل آئے اب تمہاری عنقا کے پر سلامت رہیں گے ہم تو وہاں آگئے جو عدم سے بھی پرے ہے.

مسئلہ پیچیدہ سے پیچیدہ تر ہوتا گیا. عبد و معبود کے تعلقات درہم برہم ہوتے نظر آرہے ہیں یہ ملّا جو دن رات لٹھ لئے پھرتے ہیں ایسے شخص کو بخشنے والے نہیں. اگر غالب نے ضد کی تو پھر اس کا بھی وہی انجام ہونا چاہیئے جو اس عقیدے کے ماننے والوں کا ہوا. یہ ملّا لوگوں کو ایمان کی روشنی نہیں بخشتے بلکہ ان کے قلم دوات سے صرف کفر کے فتوے ہی صادر ہوتے رہتے ہیں. یقینی غالب کو ذات واحد کی ہستی میں محبوبیت کے علاوہ معبودیت کی جھلک بھی دیکھنی چاہیئے. ہاں غالب منصور کی طرح از خود رفتہ نہیں تھا. اس نے اپنے اک تارے پر دوسرا مضراب مارا. ملّا خاموش ہو گئے.

ہے پرے سرحد ادراک سے اپنا مسجود
قبلہ کو اہل نظر قبلہ نما کہتے ہیں

جو ہستی سرحد ادراک سے بھی دور ہو اس کیلئے سجدہ ریزی کرنا تضیع اوقات نہیں تو اور کیا ہے. ہاں

اس کی عبادت کا بہترین طریقہ تصور اور صرف تصور ہے اور یہ تصور اس حالت میں نہیں کہ ہم ہوش میں رہیں بلکہ ہمارا مادی ہوش مادی شراب کی نذر ہو جائے جبھی ہماری باطنی نگاہیں اپنے محبوب حقیقی کا جمال دیکھ سکتی ہیں۔

موسم بہار آیا۔ چمن لہلہانے لگے۔ گلہائے رنگارنگ کھل کھل کر دعوت نظارہ دینے لگے۔ نسیم عطر بار اٹھکھیلیاں کرتی ہوئی پیام مسرت بخشنے لگی۔ غالب کے دل نے کہا دور جانفزا آگیا یہ وقت نہیں کہ شراب کی بوتلیں زینت طاق بنی رہیں۔ آؤ اس فضائے کیف بخش میں تم بھی اپنے آپ کو اسی سانچہ میں ڈھال لو جس طرح یہ مناظر خمار آگیں ہو گئے ہیں تم بھی اپنے آپ کو محو کر ڈالو۔ شاید حقیقت کے کچھ راز تم پر منکشف ہو جائیں۔ غالب نے .... ؎

ہوش اڑتے ہیں مرے جلوۂ گل دیکھ اسدؔ
پھر ہوا وقت کہ ہو بال کشا موج شراب

لگا کر مینائے سرخ سرخ شراب بلوریں ساغر میں انڈیلی۔ دو گھونٹ پی نہیں کہ دل ایک عجیب سرور سے لذت یاب ہونے لگا۔ آنکھیں خمار آلودہ ہونے لگیں۔ پلکیں بوجھل ہو ہو کر دل کی آنکھوں کی پلکیں اٹھانے لگیں۔ غالب عالم بیخودی میں جھومنے لگا۔ اور پھر اس کا اپنا فلسفہ بیٹھے بیٹھے لفظوں میں منظوم ہو کر اس کی زبان پر بکھر گیا۔ ہائے ہائے ظالم نے اس بیخودی میں بھی کتنی دور کی بات کہہ دی ؎

شرح ہنگامۂ مستی ہے زہے موسم گل
رہبر قطرہ بدریا ہے خوشا موج شراب

اجی قربان جائیے اس بیان کے اور صدقے اس انداز بیان پر۔ موسم گل نے ہنگامۂ مستی کی شرح کر ڈالی۔ نہ جانے کون سی مسعود ساعت میں غالب نے شراب پی ہو گی کہ اسکی موج نے قطرہ

کو دریا تک پہنچانے میں رہبری کی۔

حاصل تصوف اگر صرف معرفت ہے تو ہمیں کہہ لینے دیجئے کہ یہ شاعر اس بے بہا دولت سے مالا مال ہو چکا تھا۔ اس کا سینہ اس نور سے معمور ہو چکا تھا جس کے حصول کے لئے "آہ کو چاہیئے اک عمر اثر ہونے تک" کی ضرورت ہے۔ شاعری اگر شاعر کے دل کی آواز ہے۔ اگر اس کے خیالات کی ترجمان ہے اور اگر اس کے راز سربستہ کی عقدہ کشا اور ایقان کی آئینہ دار ہے تو پھر غالب اپنی صحیح صورت میں اپنی حقیقی موڈ (Mood) میں اگر کہیں نظر آتا ہے تو وہ اپنے شعروں ہی میں۔ غالب پر حقیقت ہستی کھل چکی تھی۔ اس کی آنکھوں سے وہ پردہ اٹھ چکا تھا جس کے نہ اٹھنے سے ہر انسان کی یہ حالت ہوتی ہے کہ ؎

چلتا ہوں تھوڑی دور ہر اک راہرو کے ساتھ
پہچانتا نہیں ہوں ابھی راہبر کو میں

اور اے دریغا وہ رند شاہد باز اس نے یہ ساری منزلیں طے بھی کیں تو کسی صوفی یا اہل معرفت کی رہنمائی میں نہیں بلکہ اس کی رہبری کرتی ہے شراب! تعجب بر تعجب۔ جس شے کو حاصل کرنے کے لئے رہروان عشق نے نہ جانے کہاں کہاں کی ٹھوکریں کھائیں اور کس کس کی منتیں کیں۔ وہی چیز غالب کو مل جاتی ہے دو گھونٹ شراب میں ؎

رہبر قطرہ بدریا ہے خوشا موج شراب

غالب کے دل نے وہ گتھی سلجھا لی تھی جسے سلجھانے کی ہر مفکر نے سعی بلیغ کی۔ غالب کی نظر میں پردے کا اٹھنا تھا کہ فریب ہستی بے نقاب ہو گئی۔ غالب مسکرا اٹھا۔

ہے غیب غیب جس کو سمجھتے ہیں ہم شہود ہیں خواب میں ہنوز جو جاگے ہیں خواب میں

اب تک جو کچھ کہا گیا غالب نے اپنی ہستی کو ساری کائنات کا ایک جزو مان کر کہا۔ اس بحث میں غالب کی اجتماعی پوزیشن (Position) وہ ہے جو ہر وجہ ذرہ و آفتاب زمین و آسمان، حیوان و انسان سب پر یکساں طور پر لاگو ہے۔ لیکن حضرتِ انسان کی انفرادی حیثیت ایک شے ہے جہاں اس مٹی کے پتلے کو اولاد آدم کی صورت میں ہم دیکھتے ہیں۔ دہریت نے انسان کو ارتقائے مادہ کی آخری کڑی کہا۔ مگر اس آخری کڑی سے مراد یہ نہیں کہ ارتقائی قوت اب انسان کی ہستی سے ناپید ہو گئی۔ ممکن ہے چند ہزار برس کے بعد جس طرح یہ انسان کیڑے سے بندر اور بندر سے انسان بن گیا۔ اسی طرح یہ انسان سے کوئی ایسی چیز ہو جائے کہ اس وقت کی وہ چیز اس تصور سے گریز کرنے لگے کہ وہ بھی کسی وقت انسان تھی۔ ممکن ہے انسان کے اندر اتنی لطافت آ جائے کہ جہاں آج اس کے تخیلات نہیں پہنچ پاتے وہاں کل یہ بذات خود بغیر کسی مادی وسائل کے سیر کرتا ہوا نظر آ جائے یہ انسان کیوں بنا اس کے جواب میں دہریت صرف اتنا کہہ کر خاموش ہو جاتی ہے کہ یہ انسان بن گیا اور بس۔ قوت جب خود مجبور محض اور صاحب عقل نہیں تو پھر انسان کی تخلیق میں راز کیا۔

مگر وہ جماعت جو اپنے آپ کو مذہبی طبقہ کہتی ہے اس میں ایک نے کہا چونکہ پرماتما، آتما اور مادے سے طاقت میں زیادہ تھا۔ اس لیے اس نے مادہ اور آتما کو ملا کر مختلف صورتیں پیدا کیں تاکہ اس کی طاقت کا اظہار ہو۔ اور پھر چند عمل ایسے گنوائے جن کے کرنے سے یہی صورتیں دوسری دوسری صورتوں میں تبدیل ہوتی رہیں۔ آتما دبی رہی مگر ہر موت پہ آتما نے اپنی موجودہ صورت بدل ڈالی۔ اور برہمن نے اس تخیل میں صرف اس قدر ترمیم کی کہ یہ آتما ایک نہ ایک دن نروان بھی حاصل کر سکتی ہے۔ یعنی ایک دن وہ بھی آ سکتا ہے کہ آتما

پلٹتا ہیں بلکہ خود بہ ماننا ہو جائے۔

لیکن اسلام نے انسان کی تخلیق کا صرف ایک کارن بتلایا۔ قرآن پاک نے کہا۔ "وما خلقت الجن والانس الا لیعبدون"۔ ترجمہ۔ اس کا یہ ہوا کہ ہم نے انسان اور جن کو صرف اپنی عبادت کے لیے پیدا کیا۔ عبادت ایک وسیع لفظ ہے۔ دوسرے مذاہب میں عبادت نام ہے ان رسومات کا جو کسی مخصوص وقت اور کسی مخصوص جگہ اپنے خدا کی مورتی کے سامنے ادا کیے جائیں جیسے زرتشتیوں نے پرستش، ہندوؤں نے پوجا، اور عیسائیوں نے آفرنگ پریئر (Offering prayer) کہا۔ مگر اسلام نے عبادت کا ایک بالکل دوسرا ہی مفہوم دیا۔ اسلام کی لغت میں انسان کا ہر وہ عمل عبادت ہے جس سے خوشنودی مولا حاصل ہو۔ ہاں ہر عمل کے لیے اس نے خلوص دل اور نیت کو ضروری سمجھا۔

غالب نے بھی مسلمانوں ہی کے عقیدے کو اپنایا۔ اور خدا کے اس قول وما خلقت الخ کی توضیح اس نے یوں کی ہے اگرچہ دہر جز جلوۂ یکتائی معشوق نہیں۔ مگر ہماری تخلیق کی علت غائی بجز اس کے اور کیا ہے کہ حسن کل اپنی حمد و ثنا سننے کا مشتاق تھا وہ چاہتا تھا کہ کائنات میں ایک ایسی ہستی بھی پیدا کی جائے۔ جو اسکے حسن کی تعریف کرتی رہے۔ حسن کی یہ خودبینی تھی جس نے ہمیں انسان بنا دیا۔ اس حسن کی تعریف و مدحت حمد و ثنا کے لیے ساری خلقت میں نہ جمادات و حیوانات کا وجود کافی تھا۔ اور نہ فرشتوں کی ٹولیاں کافی تھیں جو دن رات تسبیح پڑھتی رہتی ہیں۔ اس شاہد مطلق کے چہرہ پرنور کی تعریف۔ اس کے حسن جہاں تاب کی مدحت کے لیے انسانی زبان ہی ضروری ہے۔ اس ارادے کے خلاف اگرچہ فرشتوں نے زبان کھولی تھی۔ مگر قادر مطلق نے ایسی ڈانٹ بتائی کہ سب کے سب دم بخود رہ گئے۔ غالب نے شاہد حقیقی کی خودبینی کو اپنی تخلیق کا راز کس

لطیف پیرائے میں ادا کیا ہے۔ ملاحظہ ہو

نہ ہر جز جلوۂ یکتائی معشوق نہیں

ہم کہاں ہوتے اگر حسن نہ ہوتا خود بیں

اور یہی وجہ تو ہوئی کہ انسان نے اشرف المخلوقات کا لقب پایا۔ اور یہ فرشتے جنھیں ہم نوری پیکر اور معصوم سمجھتے ہیں طوعاً و کرہاً آدم کے سامنے سربسجود ہوگئے۔ اللہ اللہ اتنا بڑا رتبہ انسان کا مگر ان کی موجودہ پستی اور ذلت دیکھکر غالب کا دل رو اٹھا۔ اس کی نظروں کے سامنے دو منظر آئے۔ ایک وہ کہ فرشتے انسان کو سجدہ کر رہے ہیں اور دوسرا وہ کہ یہی شاہکار مطلق کے سوا ہر اس چیز کے سامنے سر نیاز جھکا رہا ہے جو درجے میں انسان سے کمتر ہے۔ کتنا متضاد واقعہ ہے یہ۔ ایک وہ منظر تھا جو ہماری رفعت کا اظہار کر رہا ہے۔ اور ایک یہ منظر ہے جو ہماری پستی و ذلت کا آئینہ دار۔ غالب کے دل کو انسان کی اس گری ہوئی حالت پر تڑپنا ہی چاہیئے تھا۔ انسان ایسی ذلیل حرکت صرف اس لئے ہی تو کر رہا ہے کہ وہ اپنے مرتبہ اعلیٰ سے واقف نہیں۔ اگر اسے اپنی ذات کی خبر ہو جاتی تو ہرگز ایسی ذلیل حرکت اس سے سرزد نہ ہوتی۔ غالب کے روتے ہوئے دل نے اس کی وجہ بھی اپنے محبوب ہی سے دریافت کی ہے

ہیں آج کیوں ذلیل کہ کل تک نہ تھی پسند

گستاخیٔ فرشتہ ہماری جناب میں

تخیلِ جنت

جنت: اجی واہ کتنا روح پرور اور کیف افزا تخیل ہے۔ بہشت! سبحان اللہ کتنی حلاوت اور شیرینی ہے۔ اس تصور ہی میں۔ وہ بڑی بڑی آنکھوں والی حوریں، ان کی وہ زہد شکن انگڑائیاں شراب انگیز جسم کی جوانیاں، اور پھر اُن کا حُسن، کون ہے جو ان کے حسن کی تصویر کھینچ سکے۔ یہ برق وش حوریں اہلِ جنت کے دلوں کو بے شمار لذتوں سے محظوظ کرتی ہوں گی اور پھر حوریں ہی نہیں شراب ناب کے بلوریں، ساغر بھی ہمارے خوش نصیب جنتیوں کی خدمت میں یہی حوریں پیش کریں گی۔ ایک ایک منظر جنت ہی اتنے دل فریب کہ جس جگہ نگاہ گئی وہیں ٹھٹک کر رہ گئی۔ وہاں کی ہوائیں ہی شراب کی تاثیر لئے ہوئے اٹھکھیلیاں کرتی ہوں گی۔ اس پر مزید اضافہ ان حسین دوشیزگان خلد کا۔ جو نہ جانے کب سے بن سنور کر، ہزار دل فریب رعنائیوں سے سج دھج کر جنت میں جانے والوں کا انتظار کر رہی ہیں۔ یہ جنت وہ جگہ ہے جہاں حزن و ملال کا گذر نہیں، جہاں غم و فکر معدوم۔ بس خوشیاں ہی مسرتیں ہیں، جہاں کچھ کھانے کی خواہش ہوئی کہ مطلوبہ شئے خود بخود مُنہ تک آگئی۔ انگور کا خیال پیدا ہوا اور انگور کے خوشے چشم زدن میں مُنہ کے سامنے آگئے۔ اور پھر ایک ڈکار آئی کہ ساری چیزیں ہضم۔ واہ واہ کتنا رنگین تخیل ہے۔ نظر فریب منظر، روح افزا سماں۔ دل کو سرور بخشنے والی شرابیں۔ آنکھوں کو نور عنایت کرنے والے جلوے۔ اور ان سب کے علاوہ شباب و شراب کی چلتی پھرتی تصویریں۔ ایک

دو نہیں، ستر ستر۔ اگر یہ حوریں نہ ہوتیں تو پھر یہ جنّت کی رنگینیاں ہم لے کر ہی کیا کرتے۔ ہر عیش بیکار ہے اگر وہاں عورت نہیں۔ اور اگر عورت پہلو میں رہی تو جنگل میں بھی منگل ہے۔ اور ظاہر ہے جنّت میں وہ ساری چیزیں میسّر ہوں گی جو نواب واجد علی کو لکھنؤ میں اور لوئی چہار دھم کو پیرس میں نصیب تھیں۔ گستاخی معاف ہندوستانی سینما کے ڈائرکٹروں کو جو چیزیں سٹوڈیو (Studio) میں نصیب نہیں وہ عیش، وہ عشرتیں جنّتیوں کو جنّت میں حاصل ہونگی۔ کس قدر لذّت بخش تصور ہے یہ۔

دنیا کے جس مذہب کا بھی جائزہ لیجیے۔ وہ بہشت کا ایک تصور ضرور پیش کرے گا۔ اور پھر ساتھ ہی ساتھ دوزخ کی ایک بھیانک تصویر بھی۔ تاکہ پیروان مذہب بہشت کے لالچ اور دوزخ کے خوف سے چند وہ رسومات بجا لائیں جو اگر نہ کیے جائیں تو ان مذہبی ٹھیکیداروں کے خیال کے مطابق جنّت ان پر حرام اور وہ غریب مستحق دوزخ۔ واہ خوب۔ مذہب کی اسپرٹ جو بھی ہو مگر آج مذہب کو جس رنگ اور روپ میں پیش کیا جا رہا ہے اسے ہم مذہب کا ڈھانچہ تو کہہ سکتے ہیں مذہب نہیں۔ مذہب عالمگیر اخوت کا حامی ہے۔ وہ انسانیت کا علمبردار ہے۔ صلح اور شانتی کا پیامبر۔ امن و سکون کا مژدہ جاں بخش۔ مذہب نے ایمان کے ساتھ ہی ساتھ عمل صالح پر بھی کافی زور دیا ہے۔ عمل صالح اگر مفقود ہے تو پھر ایسے حضرات جنّت کے تصور سے خوش ہو لیں تو ہو لیں مگر وہ حقیقت میں مذہب کے ساتھ مذاق کرتے ہیں۔ مذہب نے بانگ دہل کہا کہ زمانہ اس پر شاہد ہے کہ بیشک و شبہ انسان گھاٹے میں ہے۔ مگر وہ جو ایمان لائے، نیک عمل کیے۔ اور جو ایک دوسرے کو صبر (اہنسا) اور حق (ستیہ) کی تلقین کرتے ہیں۔ مگر ہمارے پنڈتوں نے کہا یہ نفع نقصان یعنی گھاٹا اور لابھ مرنے کے بعد ہوگا خسارہ دوزخ کی شکل میں اور نفع جنت کی صورت میں حاصل ہوگی۔ گویا ہم نے اپنا نام بندگی میں لکھوایا ہے وہ اللہ کی نہیں بلکہ اسی بہشت کی بندگی ہے۔ استغفراللہ

اس فنا فی اللہ عورت (جس کا نام رابعہ تھا) کا واقعہ تو آپ کو یاد ہوگا جو ایک ہاتھ میں مشعل دوسرے میں ایک لوٹا پانی لے کر گھر سے غصّے کے مارے نکلی تھیں، کہ جنت و دوزخ کو صفحۂ ہستی سے فنا کر دیں؟ کیا وہ پاگل تھیں (نعوذ باللہ) کیا ان کی باتیں مجذوب کی بڑ تھیں؟ نہیں، ہرگز نہیں۔ ہزاروں عقلمندوں کی عقل حقیقت شناسوں کی آگہی ان پر قربان۔ غالب نے بھی جب مذہب کے ٹھیکیداروں اور ان کے پیروؤں کی یہ حالت دیکھی تو اس کا دل بھی رو اٹھا۔ اس نے دیکھا بندگی اور اطاعت کا غلط مفہوم سمجھ رکھا ہے ان لوگوں نے۔ خوفِ خدا وہم دوزخ بن کر رہ گیا ہے۔ طاعتِ حق رشوتِ جنت کے روپ میں جلوہ گر ہے۔ غالب کا احساس دل ایسے برداشت کرنے والا کب تھا۔ اس کا دل رو اٹھا۔ گریہ نے شعر کی صورت اختیار کر لی ؎

طاعت میں تا رہے نہ مے و انگبیں کی لاگ
دوزخ میں ڈال دو کوئی لے کر بہشت کو

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جنّت کا وعدہ کیا غلط ہے؟ دنیا کے سارے مذاہب متفق ہیں کہ خدا کا وعدہ جھوٹا نہیں ہو سکتا۔ تو پھر یہ جنت ہے کیا چیز؟ اس سوال کا جواب ہر مذہب نے مختلف طور پر دیا ہے۔ مہاتما بدھ نے کہا جسے تم بیکنٹھ (بہشت) سمجھتے ہو وہ حقیقت میں نروان ہے۔ اور نروان کے معنی انھوں نے یہ بتلائے کہ آتما یعنی روح جب یونی چکر سے مکت (मुक्त) ہو جائے گی اس وقت وہ پرماتما میں مل کر خود پرماتما بن جائے گی اور یہی بہشت ہے۔ حضرت مسیح نے جنت کو اپنے باپ کی بادشاہت کہا اور اسلام نے اسے دیدارِ الٰہی سے تعبیر کیا۔ اندازِ بیان اگرچہ مختلف ضرور ہیں مگر مقصد سب کا ایک ہی ہے۔ غالب نے

نے بھی اسی خیال کو اپنایا ہے۔ ایک جگہ اس نے کہا ہے

عشرت قطرہ ہے دریا میں فنا ہو جانا
درد کا حد سے گذرنا ہے دوا ہو جانا

درد یعنی دردِ محبت۔ وہ تڑپ جو عاشق کے دل میں محبوب سے ملنے کے لئے پیدا ہو جاتی ہے۔ یہ تڑپ اور یہ بیقراری جب حد سے گذر جاتی ہے تو وہ خود دوا بن جاتی ہے۔ یہ درد جب تک اپنی حد میں رہتا ہے اس وقت تک اس کا جو بھی نام ہو مگر جہاں اس نے اپنی سرحد کو پار کر لیا کہ پھر یہ درد درد نہیں رہتا بلکہ دوا ہو جاتا ہے۔ قطرہ جب تک دریا کے باہر رہتا ہے اسے ہم قطرہ ہی کہتے ہیں اور جہاں یہ دریا میں جا ملا کہ اس کا وجود ختم۔ غالب نے کہا ہے

قطرہ دریا میں جو مل جائے تو دریا ہو جائے
کام اچھا ہے وہی جس کا مآل اچھا ہے

مولانا محمد علی ایم۔ اے۔ ایل۔ ایل۔ بی نے انگلش ترجمۂ قرآن کے دیباچے میں جنت کے متعلق ایک بہترین مضمون سپرد قلم کیا ہے۔ یہاں جگہ نہیں کہ اس مضمون کا اقتباس ہم پیش کریں۔ مگر اتنی بات ہم ضرور اپنے ناظرین سے عرض کریں گے کہ اگر آپ اس کا بغور مطالعہ کریں تو جنت کی حقیقت معلوم ہو جائے گی۔ صحیح خد و خال آپ دیکھ لیں گے۔ حور، شراب طہور اور دیگر لوازمات بہشت کے مفہوم آپ کے ذہن میں آجائیں گے۔

آج کی نشست میں غالب کی جنت پر ہم کچھ روشنی ڈالنا چاہتے ہیں۔ دیکھیں حضرت غالب نے جنت کے معنی کیا بتلائے ہیں۔ انھوں نے بہشت کو کیا سمجھا ہے۔ آج سے سو سال پیشتر غالب کے اس شعر کو

ہم کو معلوم ہے جنت کی حقیقت لیکن
دل کے بہلانے کو غالبؔ یہ خیال اچھا ہے

سنکر لوگوں نے شاید یہ سمجھا ہوگا کہ غالب ناستک ہو گیا۔ یہ دہریوں جیسی باتیں کرتا ہے اس شعر میں اس نے صاف جنت کا مذاق اڑایا ہے۔ ابھی بھی اس شعر کو سرسری نظر سے پڑھیے تو یہی معلوم ہوتا ہے کہ غالب نے جنت کی حقیقت کو دل کے بہلانے کا ہی ایک خیال سمجھ رکھا ہے۔ اور بس لیکن اس شعر کو اگر ذرا غور سے پڑھا جائے تو واقعی جنت کی حقیقت کا انکشاف ہو جاتا ہے۔ جنت اگر کسی مادی دنیا کا نام ہے جب تو یقیناً مولویوں ہی کے حسین تخیل کو ہم جنت کہہ سکتے ہیں لیکن غالب کے خیال کے مطابق جنت کسی مادی جگہ کا نام نہیں بلکہ روح کی انتہائے کمال اور حد عروج ہی کا دوسرا نام جنّت ہے۔ مادہ کا انقطاع اپنی روح سے موت کی صورت میں ہو جاتا ہے۔ روح جب اپنی مادی پوشاک اوتار کر پھینک ڈالتی ہے تو ہم اس مخصوص کیفیت کو موت سے تعبیر کرتے ہیں۔ ہماری رُوح ہزاروں صورتوں میں نمودار ہونے کے بعد انسانی شکل میں جلوہ گر ہوتی ہے۔ اور جس شکل کو یہ چھوڑ آتی پھر اس میں دوبارہ نہیں جاتی۔ عارف روم نے کہا ہے

ہمچو سبزہ بارہا روئیدہ ام
ہفت صد ہفتاد قالب دیدہ ام

بدھ ازم، ہندو ازم اور اسلام سے یہیں اختلاف ہو جاتا ہے کہ قبل الذکر مذہبوں نے ایک قالب سے نکل آنے کے بعد پھر اسی قالب میں جانے کے یقین کو اپنایا ہے اور اس کے برعکس اسلام کے تخیل کے مطابق جس قالب کو ایک مرتبہ چھوڑ دیا گیا پھر اس میں جانا

قطعی ناممکن ہے اور اسی خیال کو بھگوان سری کرشن نے اپنی گیتا میں بھی پیش کیا ہے اگرچہ آج ہندو سری کرشن کے اس مقدس اشلوک کو مہاراج منو ہی کے آواگون کے مفہوم میں ڈھال بیٹھے ہیں۔

مادی تعلقات کی آخری منزل انسانی شکل ہے۔ اس تعلقات کے ختم ہوتے ہی روحانی دنیا شروع ہو جاتی ہے جسے ہم موت کہتے ہیں۔ اسے اسلامی فلسفیوں نے انتقال اور رحلت کہا۔ چکبست نے کہا ؎

فنا کا ہوش آنا زندگی کا درد سر جانا
اجل کیا ہے خمار بادۂ ہستی اتر جانا

اور استادوں کے استاد حضرت میر فرماتے ہیں ؎

موت ایک ماندگی کا وقفہ ہے
یعنی آگے چلیں گے دم لیکر

ممکن ہے ہمارے عیسائی اور مسلمان دوست اس رائے سے متفق نہ ہوں مگر ہمیں اس مضمون میں غالب کی جنت پر روشنی ڈالنی ہے۔ حضرت غالب نے جنت کو دل کے بہلانے کا ایک اچھا خیال کہا ہے۔ دیکھنا یہ ہے کہ انھوں نے غلط بیانی سے کام لیا ہے یا جو کہا ہے حقیقت میں وہی ہے۔ ہاں اس شعر کو اس شعر سے ملا کر پڑھیے ؎

ہے خیال حسن میں حسن عمل کا سا خیال
خلد کا اک در ہے مری گور کے اندر کھلا

یہیں بتلایا گیا ہے کہ ہر عمل اپنے اندر کوئی خاص اثر اور نتیجہ رکھتا ہے۔ دنیا آخرت کی کھیتی

کا نام ہے۔ یہاں اگر ہم جو بوئیں گے تو پھر گیہوں کاٹنے کی توقع ہرگز نہیں رکھ سکتے۔ لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ہر عمل کے عوض کوئی چیز تبادلے میں ملے گی یا یہی عمل کسی حسین یا قبیح مجسمہ بن کر سامنے آجائے گا۔ غالب کہتا ہے عمل ہی کے دوسرے روپ کا نام نتیجہ ہے۔ کوئی عمل رائیگاں نہیں جاتا۔ ذرّے بھر عمل شر کیوں نہ ہو اور ذرے برابر ہی عمل خیر کیوں نہ ہو دونوں کو انسان دیکھ لے گا۔ مولوی صاحب کہتے ہیں دو فرشتے متواتر ہر قسم کے عمل کو نوٹ کیے جا رہے ہیں۔ غالب نے اسی نوٹ بک یا اعمال نامے کا نام خیال رکھا۔ اس نے ایسا کیوں کہا؟ اسے جاننے کے لیے آپ کو اپنے دماغ کی ساخت پر ایک نظر ڈالنی ہوگی۔ ہاں ڈاکٹر کی نظر نہیں بلکہ سائیکلوجسٹ (ماہر نفسیات) کی نظر۔ پیدائش سے موت تک کے کل فعل ذہن انسانی میں قید ہو کر رہ جاتے ہیں۔ کوئی عمل، کوئی واقعہ، کوئی سانحہ ضائع نہیں ہوتا بلکہ سب کے سب ذہن میں محفوظ رہتے ہیں۔

انسانی دماغ کو ہم تین حصوں میں تقسیم کر سکتے ہیں۔ فرض کیجیے انسانی دماغ ایک بڑا ہال ہے جس کا نام ہے یادداشت۔ اس یادداشت میں تین کمرے ہیں۔ لاشعوری کمرہ، نیم شعوری کمرہ اور شعوری کمرہ۔ نیم شعوری اور شعوری کمرے کے درمیان جو دروازہ ہے اس پر پردہ پڑا ہوا ہے جس کا نام ہے قوت تمیز۔ قوت تمیز کا سائن بورڈ ہے شعوری کمرے کی جانب اور رُخ ہے نیم شعوری خانے کی طرف۔ نیم شعوری اور لاشعوری خانے کے درمیان بھی ایک پردہ ہے اس کا نام ہے قوت تخیّل۔ لاشعور اور شعور کے درمیان جو پردہ ہے اسے کہتے ہیں قوت تفہیم اب اس کی شکل یوں ہوگی۔

۱ - قوت تمیز
۲ - قوت تخیل
۳ - قوت تفہیم



یادداشت

یادداشت کے تینوں خانے یہ کوئی ضرور نہیں کہ آپس میں برابر رہیں۔ مختلف عہد اور مختلف اوقات میں تینوں چھوٹے بڑے ہوتے رہتے ہیں مگر کسی کا وجود مطلق ختم نہیں ہوتا۔

کوئی واقعہ پہلے شعوری خانے میں جاتا ہے۔ جب تک وہ وہاں رہتا ہے اسے ہم فراموش نہیں کرتے۔ وہاں سے اکثر وہ خانۂ نیم شعور میں چلا جاتا ہے۔ اسے بھی ہم بھولتے نہیں لیکن کسی وجہ سے یاد نہیں رہتا۔ کسی دوست سے اگر آپ دس برس سے جدا ہوں تو ممکن ہے اس کی صورت اور اس کا نام ہر وقت آپ کی ذہنی آنکھوں کے سامنے نہ ہو لیکن اس دوست سے ملتا جلتا کوئی شخص آپ کے سامنے آیا کہ معاً آپ کا وہ دوست یاد آجاتا ہے۔ خانۂ نیم شعوری سے اکثر واقعات خانۂ شعور میں چلے جاتے ہیں اور بسا اوقات خانۂ شعور سے بھی براہ راست لاشعور کے کمرے میں واقعات چلے جاتے ہیں۔ بازار میں آپ گھوم رہے ہیں مگر کوئی ضرور نہیں کہ مکان واپس آکر ہر چیز آپ کو من و عن یاد رہے۔ مگر اتنی بات ضرور ہے کہ آپ نے جو کچھ دیکھا، سنا اور کیا وہ سب انھیں تین خانوں کے کسی خانے میں ضرور محفوظ ہیں۔

عالم بیداری میں خانۂ شعور کام کرتا ہے اور عالم خواب میں خانۂ نیم شعور۔ عالم بیداری میں ہمارے ذہن کے اندر ایک حسین تصور پیدا ہو سکتا ہے۔ ہم اپنے آپ کو کسی مطلق العنانی بادشاہ کے پوزیشن میں سمجھ کر سارے لوازمات عیش و عشرت پیدا کر سکتے ہیں مگر چونکہ

ہماری قوت تمیز بھی بیدار رہتی ہے لہٰذا اسے ہم صرف تصوری ہی تصور سمجھ کر خاموش ہو جاتے ہیں اور اگر یہ قوت تمیز فوت ہو جائے تو عالم بیداری میں ہم بالکل وہی لطف اٹھالیں جو کسی حقیقی بادشاہ کو میسر ہیں۔ اگرچہ ہمارا لطف صرف خیالی ہی ہوگا مگر ہوگا ضرور۔ ایک خوابیدہ انسان، پاگل، شرابی اور معمول تنویم (HYPNOTIZED) کی چونکہ قوت تمیز برباد ہو جاتی یا کر دی جاتی ہے اس لیے اس کی تخئیل میں جو شئے ظاہر ہوتی اسے وہ حقیقت سمجھنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ خواب کی مذہبی تعریف جو بھی ہو مگر نفسیاتی تعریف خیال ہی ہے۔

خواب میں جو کیفیتیں آپ پر گذرتی ہیں کیا ان کیفیتوں سے آپ اسی قدر محظوظ اور لذت یاب نہیں ہوتے جس قدر عالم بیداری میں انھیں مناظر سے ہو سکتے تھے۔ کسی دوشیزہ کی ملاقات یا کسی بھیانک منظر سے آپ مسرور و خوف زدہ نہیں ہو جاتے؟ یقینی ایسا ہوتا ہے اور یہ ہوتا ہے صرف اس لیے کہ آپ کی قوت تمیز بھی سوئی رہتی ہے۔

موت ایک دوسرا خواب اور دائمی خواب ہے۔ موت کے آتے ہی تینوں خانے کا امتیاز مٹ جاتا ہے۔ صرف خانۂ یادداشت رہ جاتا ہے۔ خواب عارضی موت ہے اور موت ابدی خواب۔ اگر اس تھیوری سے آپ نے اتفاق کر لیا تو جنت کی ساری لذتیں خیال سے بڑھ کر کوئی دوسرا وجود نہیں رکھتیں۔

اور یہی وجہ تو ہوئی جب حضرت زاہد نے باغ رضواں کے دلکش حسین مناظر حضرت غالب کے سامنے پیش کئے تو فوراً غالب کے ذہن نے اپنی آفرینش کی طرف رجعت کی۔ اس کے دل نے کہا جس جنت کی طرف اشارہ حضرت واعظ کر رہے ہیں وہ تو ہمارے ہی خانۂ لاشعور میں محفوظ ہے۔ اس کا وجود کوئی مستقل وجود تو ہے نہیں کہ حضرت زاہد کی ساحرانہ تقریر

کی اہمیت دی جائے۔ جب حسن عمل ہی حسن خیال بن جاتا ہے تو جنت کی صورت اختیار کرلیتا ہے ایسی جنت کے خالق تو ہم اور آپ ہیں۔ ایسی جنتیں تو ہمارے طاق نسیاں کے گلدستے ہیں۔ زاہد کی باتیں .... حور و غلماں، کوثر و تسنیم، دلاویز مناظر .... سنتے سنتے غالب کے کان پک گئے۔ اس نے جھنجھلا کر حضرت زاہد کو مخاطب کیا ..... مگر خدا کی قسم کیا پتے کی بات کہہ رہی ہے

ستائش گر ہے زاہد اس قدر جس باغ رضواں کا

وہ اک گلدستہ ہے ہم بیخودوں کے طاق نسیاں کا

مولانا آسی شارح دیوان غالب کہتے ہیں اس شعر میں غالب نے جنت کی تحقیر کی کی ہے مگر مناسب لفظ گلدستہ لائے ہیں۔ ہم کہتے ہیں جناب آسی۔ غالب نے ہرگز جنت کی تحقیر نہیں کی بلکہ جنت کی عظمت بیان کی ہے جنت کی حقیقت سے پردہ اٹھانے کا نام اس کی تحقیر یا اس کا انکار نہیں۔ غالب کی نگاہ حقیقت بیں نے جنت کی ساری رعنائیاں دیکھ لی تھیں۔ بہشت کے اسرار اس پر کھل چکے تھے۔ پھر اس کی زبان خاموش کیوں رہتی۔ وہ منافق تو تھا نہیں کہ دیکھتا کچھ اور کہتا کچھ اس نے جنت کے اصلی روپ کو دیکھا تھا اسی کو اس نے عوام سے کہہ دیا۔ اب اگر کوئی صاحب اس کی باتوں سے متفق نہیں تو پھر اس کی پروا غالب جیسے رند مشرب کو مطلق نہیں۔ خیال حسن ہی جب جنت ہے تو پھر یہ خیال دل کے بہلانے کے لئے تو ہے ہی۔ اور جب خیال حسن میں حسن عمل کا سا خیال ہو تو اس خیال کی حقیقی جائے سکونت کوئی خارجی جگہ ہرگز نہیں ہو سکتی۔ اس خیال کو یادداشت کے تینوں خانے میں سے کسی ایک ہی میں رہنا ہے۔ بہت سے نازک اور حسین خیال خانۂ

لاشعور میں قید ہیں۔ خانۂ لاشعور سے خیالات پہلے خانۂ نیم شعور میں آتے اور پھر وہاں سے بذریعہ خواب (یا کسی ایسی چیز کے استعمال کے بعد، یا ناگہانی طور پر جب قوت تمیز کا پردہ سرک جاتا ہے تب) خانۂ شعور کی طرف چلے ہیں۔ اور پھر ہماری باطنی نگاہیں وہ وہ مناظر دیکھنے لگتی ہیں۔ جن کا احساس کم از کم گلشن کشمیر نہیں۔ اور بسا اوقات کسی مخصوص انسان کی بلند ہمتی ان مناظر کے تخیل کو خانۂ لاشعور سے عالم بیداری ہی میں خانہ شعور کی طرف کھینچ لاتی ہے۔ مگر ایسے انسان دنیا میں بہت کم نظر آتے ہیں اور جو نظر آتے ہیں انھیں ہم مادی اصطلاح میں فلسفی سائنسدان اور شاعر کہتے ہیں۔ شاعر سے ہمارا مطلب وہ شاعر نہیں جو کمر کی باریکی اور تیغ نگہ کی بندش میں رطب اللسان رہتے ہیں۔ بلکہ یہ شاعر وہ ہوتے ہیں جن کی شاعری پیغمبری کا جزو کہلاتی ہے۔ غالب وہی شاعر ہے جس کی شاعری کو ہم الہامی کہتے ہیں۔ غالب کے ذہن رسا نے ان ان چیزوں کا مشاہدہ کیا ہے اور ایسی ایسی چیزیں دیکھ لی ہیں جن کے مشاہدے کیلئے انسان کو پہلے قید حیات سے آزاد ہو جانا پڑے گا۔ اس نے جنت کی حقیقت پر غور کیا اور پھر مضامین غیب سے آنے لگے اور پھر اس کے خیالات نے شعر کا جامہ پہن لیا۔ غالب نے دیکھا جس جنت کا شور لوگوں نے مچا رکھا ہے وہ اپنی ذات سے علیحدہ کوئی شے نہیں یہ وہی حسن عمل ہے جو خیال حسن بن کر انسان کے خانہ لاشعور میں محفوظ ہے۔ اس خانۂ لاشعور کو اس نے غزل کی زبان بخشی۔ اس شعر کو ایک دفعہ پھر پڑھیے۔

۵ ستائش گر ہے زاہد اس قدر جس باغ رضواں کا
وہ اک گلدستہ ہے ہم بیخودوں کے طاق نسیاں کا

اس رازدار فطرت نے اس شاعر حقیقت شناس نے باغ رضواں کو اپنے طاق نسیاں کا ایک

گلدستہ بنا ڈالا۔

مگر غالب جانتا تھا کہ جس راز کو وہ عوام سے کہہ رہا ہے اسے اہل دنیا ہرگز یقین نہ کریں گے۔ حقیقت کا انکشاف تو مرنے کے بعد ہی ہوگا۔ مگر کوئی شخص زندہ تو ہوا نہیں کہ اصلیت کا اظہار ہو جائے اور پھر غالب نے کچھ پیغمبری یا غوثیت کا دعوی تو کیا نہیں کہ اہل مذہب اس کی باتوں کو جز: مذہب سمجھ کر ایمان لے آئیں۔ اب تک جس محبوب (یعنی جنّت) کی پرستش اور پوجا کی جا رہی ہے ہر مذہب کے علمبردار نے اسے ایک خارجی روپ دے رکھا ہے۔ سارے مذاہب کے برعکس اس بہشت کو ذہنی شئے قرار دینا بانگ دہل مذہب سے بغاوت نہیں تو اور کیا ہے؟ غالب اگر واقعی جنّت کی حقیقت یہی سمجھتا ہے جو اس کے شعروں سے آشکارا ہے تو یقینی وہ باغی مذہب ہے۔ مذہب کے تصور کے بالمقابل اپنا ایک خاص نظریہ منظر عام پر لانا بالتحقیق مذہب کو خیرباد کہنا ہے ایسے شخص کو مذہب کی زبان میں مرتد کہتے ہیں۔ غالب کا ارتداد ایسا نہیں جو معاف کیا جا سکے؟ کیوں!

غالب کی طبیعت کی جولانی اپنی انتہائی حدود کو پار کرتی ہوئی چلی جا رہی تھی۔ اس کے تخیل کی بلند پروازی ارفع سے ارفع مقامات سے گذرتی ہوئی نکل رہی تھی اسکی نگاہوں کے سامنے بیشمار رموز پنہاں بے نقاب ہوتے چلے آ رہے تھے۔ عنقریب تھا کہ غالب کچھ ایسی بات کہہ دیتا جسے سنکر دنیا اگر اس کی گردن نہ مارتی تو کافر ضرور کہہ دیتی۔ مگر عین وقت پر غالب کو ہوش آ گیا اس نے آنکھیں کھولکر دیکھا تو اپنے آس پاس ان لوگوں کی اکثریت دیکھی جن کی نگاہوں پر لاعلمی کا غلاف چڑھا ہوا ہے۔ ان

حضرات کے سامنے ایسے اسرار کی عقدہ کشائی پاگل پن اور جنون سے کم نہیں جن کے دل حق آشنا نہیں جن کی نگاہیں معرفت بیں نہیں اور جن کے گوش حقیقت نیوش نہیں۔ ان کے سامنے وہ باتیں جن کا تعلق موت کے بعد والی حیات سے ہے۔ کیوں کر قابل قبول ہو سکتی ہے۔ جن لوگوں کے جسم سے زیادہ ذہن غلام بن چکے ہوں ایسے لوگوں کے دل غالب کی حریت اور آزادی تخیل کو تسلیم کرنا تو درکنار سمجھ بھی نہیں سکتے۔ غالب نے حیات دنیوی کو راز معشوق سے تعبیر کیا۔ لوگوں نے سمجھا یہ شرابی نشے کی حالت میں اول فول بک رہا ہے۔ غالب نے کہا اے فرضی جنت کے شیدائیو! تم جس جنت موہوم کی امید میں دن رات چند لایعنی حرکات عمل میں لاتے رہتے ہو اے کاش وہ جنت بھی ہوتی۔ لیکن جب تمہاری روح جسد عنصری سے آزاد ہوگی اس وقت تمہیں معلوم ہوگا کہ ہاں غالب بھی کوئی تھا جو حقیقی واقعات کی پردہ کشائی کر رہا تھا۔

اتنا ہونے کے باوجود غالب دنیا والوں سے مرعوب نہ ہوا اس نے بڑے لطیف پیرائے میں دنیا والوں کو دھمکی دی ہے

دیکھیو غالب سے گر الجھا کوئی
ہے ولی پوشیدہ اور کافر کھلا

اور آج تک ہم اس شعر کو غالب کی ایک شاعرانہ تعلی بلکہ تمسخر سمجھتے ہیں۔ غالب محسوس کر رہا تھا کہ دنیا جس زبردست فریب میں گرفتار ہے جس جنت کے لالچ میں یہ جی رہی ہے۔ حقیقت میں محبوب کی اداؤں کا اس نے غلط اندازہ لگایا ہے۔ ہائے اس وقت کیا ہوگا جب موت کے بعد دنیا والوں کے خیال باطل کے تار دید دیکھ کر رہ جائیں گے

کس درد بھرے دل سے آہ نکلتی ہے غالب کا بیقرار دل گنگنا اٹھا۔ ساری کائنات رو اٹھی

راز معشوق نہ رسوا ہو جائے
ورنہ مرجانے میں کچھ بھید نہیں

مگر وہ دیکھیے غالب کے لقور نے ایک دوسری کروٹ لی۔ تخیل نے شکست تسلیم نہ کی بلکہ اہل دنیا کو طنز مارا۔ غالب نے دیکھا اس کی نظریہ کی تائید کرنے والا کوئی نظر نہیں آتا اس کی پکار پر کان دینے والا ایک فرد بھی نہیں۔ جس حقیقت کی طرف وہ اشارہ کر رہا ہے اس کی طرف نگاہ غلط انداز بھی کسی کی اٹھنے والی نہیں تو اس نے ایک جنت کی تعمیر کی۔ گویا درپردہ غالب نے جنت کے پجاریوں سے کہا کہ تم جس جنت کی رنگین امید کے بھروسے جی رہے ہو اگر واقعی وہ کوئی جگہ ہے تو آؤ اس سے بہتر اور دلفریب روح پرور اور نشاط افزا جنت ہم پیش کرتے ہیں۔ یہ وہ جنت ہے جس پر تمہاری جنتیں قربان ہو سکتی ہیں ذرا مضمون کا اچھوتا پن، تخیل کی بلند پروازی، لطیف انداز بیان اور مرصع نگاری ملاحظہ ہو۔ شعر ہے ؎

لطف خرام ساقی و ذوق صدائے چنگ
یہ جنت نگاہ وہ فردوس گوش ہے

جس جنت کی تشریح غالب کے دماغ نے کی، اور جس جنت کے اصلی مقام سے غالب واقف ہو چکا تھا۔ اس جنت کے علاوہ اگر کوئی اور جنت ہو سکتی ہے تو وہ جنت بجز۔ اس کے کہ لطف خرام ساقی و ذوق صدائے چنگ ہے اور کیا ہو سکتی ہے؟

کیا اس شعر میں وہ ساری چیزیں نظر نہیں آ رہی ہیں جو جنت الحمقا کے لوازمات خصوصی میں

اور اس سے بڑھ کر اور کون پاگل ہو سکتا ہے جو اسی لطف خرام ساقی و ذوقِ صدائے چنگ کو حاصل عبادت اور انعام آخرت سمجھ رہا ہو۔ یہ چیز تو وہ ہے جو یہاں حاصل ہو سکتی ہے۔ اس جنت نگاہ کو اگر ہم حاصل کرنا چاہیں تو گرہ سے چند روپے خرچ ہوں گے اگر اس فردوس گوش کے ہم متمنی ہیں تو جیب سے کچھ پیسے نکالنے ہوں گے یہ جنت اور بہشت یہاں بھی حاصل ہو سکتی ہے توبہ توبہ۔ ان ظاہر بینوں نے جنت کی وقعت کو اتنا گرا دیا؟ ہائے ہائے۔ اے جنت تو دوزخ میں جا کر کیوں نہیں جل جاتی۔ تیرے وجود موہوم نے ایک عالم کو گمراہ کر رکھا ہے۔ مئے وانگبیں کی لاگ نے مشاہد حقیقی کی طرف سے خیالات پلٹ دیئے ہیں اس شخص کی سادگی پر قربان جایئے جو ہزاروں دشوار گذار گھاٹیاں طے کر رہا ہو مگر اس کے دل کو وصال محبوب کی تمنا نہ ہو بلکہ ہو چند انگور کے خوشوں اور .... معاذ اللہ اس تخیل محض سے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں

آخر غالب انسان ہی تھا کسی ایک بات کو اگر مختلف پیرایوں میں آپ سے .. کہا جائے تو وہ بات لاکھ جھوٹی سہی آپ کو یقین کرتے ہی بنے گا۔ جنت کی رنگینیاں حسین مناظر، دلفریب سماں، حوروں کے حسن بے پناہ کی مسلسل تعریفیں غالب کے سامنے بصد عنوان پیش ہونے لگیں۔ غالب کے دل نے بھی اس جنت کے دیکھنے کی تمنا ظاہر کی مگر قربان جایئے اس کی ہمت مردانہ اور جرأت رندانہ کے۔ اس کی نگاہ نہ حور و دن پر پڑی، اور نہ اس کی اشتہائے خواہ مخواہ نے جنت کے انواع اقسام لذیذ کھانوں کی خواہش ظاہر کی۔ اس رند خرابات کو اگر جنت (یعنی وہ جنت جس کا لالچ ہمیں دیا گیا) عزیز بھی ہے تو کس لئے؟ ذرا اسی کی زبانی سنئے اور اس کی بلند ہمتی کی داد دیجئے

وہ چیز جس کے لئے ہو ہمیں بہشت عزیز ۵

سوائے بادۂ گلفام مشکبو کیا ہے

اے ہے کیا پتے کی بات کہدی اس ظالم نے۔ اب اس بادۂ گلفام مشکبو کو خواہ روحانی دونوں صورتوں میں غالب کا مقصد پورا ہو جاتا ہے۔ اور پھر مذہبی پنڈتوں کی بات بھی رہ جاتی ہے۔

مگر غالب اپنے ارادے میں اٹل تھا۔ جنت کی تخئیل جو اس کے ذہن میں آچکی تھی جنت کا خوشنما مناظر جو اس کے خانۂ لاشعور میں محفوظ ہیں اس کے تصور سے وہ سر مو تجاوز کرنا نہیں چاہتا ہے۔ جنت کی ساری رعنائیاں اور ہزار دلفریبیاں ایک طرف اور غالب جیسے بندۂ خاص پرستار محبوب، آقا کے بھگت اور اپنے معشوق کی ادا پر جان چھڑکنے والے انسان کی ضد ایک طرف۔ یہ جنت خواہ ذہنی آفرینش ہو خواہ خارجی کوئی شئے ہو غالب جیسے فنا فی العشق بندے کو اس کی مطلق پرواہ نہیں۔ اسے تو صرف اپنے محبوب کا دیدار ہی مطلوب ہے وہ تو صرف اپنے محبوب کے رُخ زیبا کے دیکھنے ہی کا متمنی ہے۔ اس نے جنت کی ساری تعریفیں سن لیں مگر ان چیزوں سے اس عاشق صادق کے دل کی پیاس بجھنے والی نہیں وہ تو اپنے محبوب کو بے نقاب دیکھنا چاہتا ہے وہ تو حاصل عبادت اور جنت کی غایت بس یہی سمجھتا ہے کہ وہ اپنے محبوب کے حضور میں بیٹھا ہو۔ اس کی مدحت اس کی حمد و ثنا کے نغمے گاتا رہے۔ اس نے اپنی تمنا ظاہر کی۔ اس تمنائے خاص جو حاصل زندگی ہے موزوں الفاظ میں نکل پڑی۔ یقینی فردوسیوں میں سرگوشیاں ہونے لگی ہوں گی۔ حوران خلد عالم وجد میں رقص کرنے لگی ہوں گی۔ ساری

بہشت جھوم اٹھی ہوگی۔ غالب نے نغمہ چھیڑا اور عرش اعظم وجد میں جھومنے لگا۔

سنتے ہیں جو بہشت کی تعریف سب درست
لیکن خدا کرے وہ تیری جلوہ گاہ ہو

غالب! تیری تمنا بھی فیصلے کا حکم رکھتی ہے۔ تو نے تو خود کہا ہے

دیتے ہیں بادہ ظرف قدح خوار دیکھ کر

تیرے ظرف میں وہ وسعت ہے کہ تو نے اپنے محبوب کو بے نقاب دیکھ لے اور تیرا دل بجائے بیہوش ہونے کے مدہوش ہو جائے۔

حیات بعد موت کی بات چھوڑیئے۔ غالب نے اسی دنیا میں ایک ایسی بات کہہ دی جسے بڑے سے بڑے دل والوں نے بھی کہنے کی ہمت نہ کی

کیا فرض ہے کہ سب کو ملے ایک سا جواب
آؤ نہ ہم بھی سیر کریں کوہ طور کی

کتنا اعتماد ہے اپنے دل پر اور یہ اعتماد صرف اس لیے ہے کہ غالب کو جنت کے حور و غلماں، کوثر و تسنیم کی غرض نہیں۔ یہ تو وہ شہید ہے جس پر خود حوروں کی آنکھ پڑتی ہے اور یہ ان کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھتا

اک خوں چکاں کفن میں کروڑوں بناؤ ہیں
پڑتی ہے آنکھ تیرے شہیدوں پہ حور کی

اب ایک سوال یہ رہ جاتا ہے کہ غالب کے دماغ نے جس تخئیل بہشت کو قبول کیا ہے وہ اگر صحیح ہے تو قیامت اور قیامت کے حساب، کتاب، عمل نیک

کی جزا۔ عمل بد کی سزا یہ سب چیزیں بھی بیک قلم بے معنی اور ڈھکوسلے بنکر رہ جاتی ہیں۔ غالب کی جنت پر یقین کر لینے کے بعد قیامت کا جھگڑا ہی چک جاتا ہے اس کے جواب میں ہم صرف اتنا عرض کرنا چاہتے ہیں کہ غالب ہمہ اوست کے قائل تھے۔ از روئے مذہب حقیقت قیامت اور اصلیت جنت جو بھی ہو غالب نے کبھی ان باتوں کو ایک مذہبی انسان کی نظر سے نہ دیکھا۔ ہمہ اوست کا فلسفہ اس رندبلانوش پر اس قدر غالب تھا کہ واقعی وہ ان چیزوں کا انکار کر گیا۔ اس کی اس ادا کو خواہ آپ انحراف از مذہب کہیں خواہ مذہب سے بغاوت۔ مگر اس نے صاف صاف کہدیا ہے

اصل شہود و شاہد و مشہود ایک ہے
حیراں ہوں پھر مشاہدہ ہے کس حساب میں

پند و نصائح

شاعری اگر جزو پیغمبری ہے تو ایک حقیقی شاعر کے سر بہت سی ذمہ داریاں غیر شعوری طور پر عائد ہو جاتی ہیں۔ شاعر اور پیغمبر کی ذات میں کوئی چیز مشترک نہیں ہو سکتی، دونوں کی ہستیوں میں زمین و آسمان کا فرق ہوتا ہے ایک عام انسان ہے دوسرا خدا کا برگزیدہ بندہ۔ ایک گنہگار ہے دوسرا معصوم مطلق۔ مگر پیغمبری اور شاعری میں بہت کچھ مماثلت ہوتی ہے۔ شاعری سے میرا مقصد قافیہ پیمائی اور تک بندی نہیں، بلکہ وہ جوہر جو موزوں الفاظ کا جامہ پہن کر قوم اور سماج کی بیماریاں دور کرتا ہے۔ ایک پیغمبر کی بعثت کا منشائے ایزدی بجز اس کے اور کیا ہے کہ قوم تاریکیوں میں بھٹک رہی تھی اس کی نظروں سے صراط مستقیم اوجھل تھا۔ وہ عمیق غار کے دہانے کی طرف آنکھیں بند کئے ہوئی چلی جا رہی تھی کہ عین وقت پر قدرت نے ایک چراغ روشن کیا، راستہ صاف نظر آنے لگا اور پھر قوم نے اپنی منزل مقصود کا راستہ دیکھ لیا۔ راہ ہدایت پر قدم رکھتے ہی اب قوم کو فکر ہوئی کہ جس محبوب کی بارگاہ کی طرف وہ گامزن ہے وہ محبوب خود جمیل ہے اور جمال کو پسند فرماتا ہے تو لازم ہے اپنے اندر جن بیماریوں نے پیدا ہو کر جسم کو داغدار بنا کر بدنما کر دیا تھا۔ ان بیماریوں کا بھی علاج کر لیا جائے۔ تاکہ حسن مطلق کے دربار میں اپنے جسم کی بدنمائی باعث خفت نہ ہو۔ اور پھر ان بیماریوں کی اصلاح کیا نیز ان پرہیزوں کی طرف نظریں پھیر دی گئیں جن سے مزید کسی دوسری بیماری

کا خدشہ نہ ہو۔

گیتا میں شری کرشن جی نے اپنے ظہور کی غایت ان لفظوں میں بیان کی ہے۔

" यदा यदा ही धर्मस्य: ग्लानिर्भवति भारत।

अभ्युत्थानीम धर्म्मस्य: तदा त्मानं सृजथामहम ॥

परित्रानाय साधुनं, बिनाशाय च दुस्कृताम।

धर्म्म संस्थापनार्थाय सभवानी युगे युगे ॥

یعنی جب جب مذہب میں خرابیاں پیدا ہو جاتی ہیں اور مذہب سے قوم کی قوم روگرداں نظر آتی ہے تو میں اپنے آپ کو ظاہر کرتا ہوں ــــ میرے ظہور کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ میں نیک لوگوں کی حفاظت اور بروں کو ختم کرتا ہوں اور اس طرح ہر زمانے میں مذہب کی تجدید کرتا رہتا ہوں اور پیغمبر کا کام یہی ہوتا ہے۔ پیغمبر اپنی قوم کے لیے بہت سی باتیں ضابطہ کی صورت میں بیان کر دیتا ہے۔ اور بہت سے کام وہ عملی طور پر کر کے دکھلا دیتا ہے اور پھر جب اس کا کام ختم ہو جاتا ہے تو وہ جس بارگاہ حسن کا فرستادہ ہے وہیں واپس چلا جاتا ہے۔ مگر انسان جو خیر و شر کا مجموعہ ہے اس پر چند روز کے بعد پھر شر غالب آتا ہے اور وہ پھر شیطان کا پیرو بن جاتا ہے اور جب اس کی حالت ناگفتہ بہ ہو جاتی ہے تو پھر کسی اور پیغمبر کا ظہور ہوتا ہے۔ یہ سلسلہ اس وقت سے جاری ہے جب سے نوع انسان کا وجود دنیا میں ہے۔ مگر اس سلسلے کو ایک دن ختم ہونا تھا۔ اس لیے نہیں کہ انسان کو ان مقدس ہستیوں کی اب ضرورت باقی نہیں رہی بلکہ اس لیے کہ بتدریج دنیا جس جس دور سے گذرتی رہی اس کی تاریخی اور جغرافیائی، سیاسی، اخلاقی ارتقاء کا تقاضا تھا کہ اس ارتقاء کا احساس ساری دنیا ایک وحدت میں دیکھ لے۔ اور جب فلسفی اپنی

اصطلاح میں عقلِ کل کہتے ہیں اسے دنیا کے ہر گوشے کے مفکر وحدت کی صورت میں دیکھ لیں۔ اس عقلِ کل کے احساس کے بعد مزید رہنمائی کیلئے پیغمبر کی ضرورت نہیں، لہٰذا پیغمبروں، رسولوں، نبیوں رشیوں، منیوں، اور پراونٹ کے سلسلے کی آخری کڑی کی سب سے بڑی ڈیوٹی تھی کہ وہ سارے عالم کو مخاطب کر کے اسی عقلِ کل کی وحدت کی گتھی سلجھا کر رکھدے۔ اور جب یہ گتھی سلجھ گئی تو پھر وہ سارے عالم کو دعوتِ فکر و نظر کے لئے روشن دلیل، ایک کتاب مبین دے دے کہ تمہارے پاس یہ کتاب قیامت تک کیلئے چھوڑے جاتا ہوں .... اور اس طرح یہ سلسلہ ختم ہو جاتا ہے۔

تو کیا اس سے غلط فہمی پیدا ہونے کا امکان ہے کہ نعوذ باللہ سری کرشن جی نے جو یہ کہا کہ جب جب دنیا تاریکیوں میں گرفتار ہو جاتی ہے میں اس کی رہنمائی کے لئے آجاتا ہوں؟ جی نہیں، مقدس گیتا کے پاک اشلوک اپنی جگہ پر ہیں۔ پیغمبر کا سلسلہ بلا شبہ ختم ہو گیا۔ مگر پیغمبری کا سلسلہ قیامت تک ختم نہیں ہو سکتا۔ خود محسنِ اعظم صلعم نے ارشاد فرمایا ہے کہ میری اُمت کے علماء نبی اسرائیل کے نبیوں کے برابر ہیں۔ عالم وہ نہیں جو دیوبندی یا بریلی سے فضیلت کا پگڑ اڑا لیتے ہیں اور اپنے سر پر رکھکر ایک دوسرے کی تکفیر کرنے چلتے ہیں۔ عالم وہ مجتہد العصر نہیں جن کے دلوں میں دوسروں کی طرف سے ہزاروں بغض و کینہ بھرے رہتے ہوں۔ عالم صاحبِ علم کو کہتے ہیں۔ علم کا تعلق عقل کا ہے اور عقل ایک پرتو ہے عقلِ کل کا۔ یہ وہ علم ہے جس کے متعلق عقلِ کل کے محبوب نے فرمایا کہ — میں علم کا شہر ہوں اور حضرت علیؑ اس کے دروازہ ہیں — یہ دروازہ ہر خاص و عام کیلئے کھلا ہوا ہے مگر مشیت جسے وہاں تک پہنچا دے۔

غالب ندیم دوست سے آتی ہے بوئے دوست مشغول حق ہوں بندگی بو تراب میں

پیغمبری کا تعلق کسب سے نہیں۔ اسی طرح شاعری بھی بالکل وہی چیز ہے۔ شاعر کا انتخاب خود قدرت کرتی ہے۔ جب خالق کون ومکاں کو یہ ضرورت محسوس ہوتی ہے کہ اب دنیا کی ہدایت کیلئے کسی کو بھیجا جائے تو اس کی محبت کی نگاہیں کسی ایک انسان کو چن لیتی ہیں۔ اور پھر وہ انسان باب العلم ہوتا ہوا مدینۃ العلم میں داخل ہو جاتا ہے۔ اس کی نظروں کے سامنے حقیقتیں بے نقاب آجاتی ہے۔ یہ شخص وہ دیکھنے لگتا ہے جسے عام انسان نہیں دیکھتے، یہ وہ سنتا ہے جو دوسرے سن نہیں سکتے..... ..... اس مخصوص شخص کی زبان ایسی ایسی باتیں بولنے لگتی ہے کہ پہلے عوام اسے بالکل بے معنی سمجھنے لگتے ہیں اور اس پر مہمل گو کا فتویٰ صادر ہونے لگتا ہے۔ انسانی عقل اپنے عجز کا اظہار کر بیٹھتی ہے اور پھر کوئی بول اٹھتا ہے کہ ؎ ان کا کہا یہ آپ سمجھیں یا خدا سمجھے ------ یقینی شروع شروع میں ایسے شخص کی گفتار انسانی عقل کے احاطے میں نہیں آسکتی، لیکن جوں جوں اس کی باتیں سمجھ میں آنے لگتی ہیں عوام اس ہستی کا منہ حیرت سے تکنے لگتے ہیں کہ یا اللہ یہ کوئی انسان ہے یا انسان سے اعلیٰ کوئی اور ہستی :۔ لیکن وہ انسان ہی ہوتا ہے ہمارے اور تمہارے جیسا۔ فرق صرف اتنا ہوتا ہے کہ وہ جو کچھ کہتا ہے وہ پیداوار ہے اس عقل کی جس عقل سے اس کی عقل کا تار مل جاتا ہے۔ دوسرے لفظوں میں یوں سمجھ لو کہ اس کی باتیں الہامی ہوتی ہیں۔ جس طرح پیغمبری کی زبان وہی ہوتی ہے جس قوم میں پیغمبر جنم لیتا ہے ٹھیک اسی طرح ایک شاعر اسی زبان میں شاعری کرتا ہے جس قوم کا وہ ایک فرد ہوتا ہے۔

شاعر یوں تو دنیا میں لاکھوں پیدا ہوتے اور مرجاتے ہیں لیکن وہ شاعر جس کی شاعری پیغمبری کا جزو کہی جاسکتی ہے وہ لاکھوں میں ایک ہی ہوتا ہے۔ شاعری ایک فطری جذبہ ہے جو ہر انسان کے دل میں کم وبیش ضرور ہے۔ کچھ لوگ ایسے ہوتے ہیں جو اسی جذبے کو موزوں الفاظ میں پیش

کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں اور انھیں ہم شاعر کہتے ہیں۔ انھیں لوگوں میں سے کسی ایک کو مشیت ایزدی انتخاب کر لیتی ہے اور اسی سے پیغمبری کا کام لیتی ہے۔ یہ مبارک ہستی اپنے قلم کی ایک ادنیٰ جنبش سے وہ بات کہہ دیتی ہے جسے دوسرے لاکھ سر ماریں ہرگز نہیں کہہ سکتے۔ اس شاعر کا کام حقیقت کی صرف نقاب کشائی نہیں ہوتی بلکہ وہ قوم اور سماج (بلا تفریق مذہب و ملت نیز جغرافیائی حدود) کی ان بیماریوں کو بھی دور کرتا ہے جن میں قوم مبتلا رہتی ہے۔ یہ ان پرہیزوں کی طرف بھی سماج کی توجہ مبذول کراتا ہے۔ جن پر عمل پیرا ہو کر انسان ہر قسم کی بیماریوں سے نجات پاتا ہے۔ اسے ہم حکیم الامت بھی کہہ سکتے ہیں۔ ڈاکٹر اور حکیم جسم کی بیماریاں دور کرتے ہیں۔ اور یہ حکیم روحانی امراض کا معالج ہوتا ہے۔

غالب نے جہاں مستی اور شاہد پر خامہ فرسائی کی ہے وہیں اس نے چند نصیحتیں بھی کی ہیں۔ جہاں اس نے اپنے محبوب کے جمال دل افروز کو دیکھا ہے وہیں اس کی نظران پرہیزوں کی طرف بھی گئی ہے۔ جن پر اگر ایک انسان عمل کرے تو اسے اپنے محبوب کی بارگاہ حسن میں کسی قسم کی خفت نہیں ہو سکتی۔ اس نے دنیا والوں کو مخاطب کیا اور کہا خبردار دنیا کی رنگینیوں میں نہ آجانا۔ اس کی رنگینیوں میں جو گرفتار ہوا اس کی قسمت سیاہ ہو گئی، وہ شخص سیاہ رو ہو جاتا ہے۔ شیطان اپنے پورے حربے ہتھیار کے ساتھ تمہیں اپنے دام فریب میں گرفتار کرنے کے لئے ہمہ وقت تیار ہے۔ اس کے ایجنٹ (Agent) مختلف صورتوں میں یہاں جلوہ گر ہیں۔ اگر اپنے ایمان کی خیر چاہتے ہو تو خبردار دامن بچائے رکھو۔ ذرا انھی کی زبانی یہ قطعہ ملاحظہ ہو ؎

اے تازہ واردانِ بساطِ ہوائے دل

زنہار اگر تمہیں ہوسِ نائے و نوش ہے

دیکھو مجھے جو دیدۂ عبرت نگاہ ہو
میری سنو جو گوش نصیحت نیوش ہے
ساقی بجلوہ دشمن ایمان و آگہی
مطرب بنغمہ رہزن تمکین و ہوش ہے
یا شب کو دیکھتے تھے کہ ہر گوشۂ بساط
دامان باغبان و کف گل فروش ہے
لطف خرام ساقی و ذوق صدائے چنگ
یہ جنت نگاہ وہ فردوس گوش ہے
یا صبح دم جو دیکھیے آ کر تو بزم میں
نے وہ سرور و سوز نہ جوش و خروش ہے
داغ فراق صحبت شب کی جلی ہوئی
اک شمع رہ گئی ہے سو وہ بھی خموش ہے

اوپر ہم نے جو قطعہ درج کیا ہے اس کی زبان ایک شاعر کی زبان ہے۔ ہر شعر میں شعریت بدرجہ اتم موجود ہے۔ لفظ لفظ کے انتخاب میں شاعر کی عالی ہمتی پوشیدہ ہے۔ بندش اتنی چست کہ بیساختگی ہزاروں جان سے قربان۔ مگر مضامین قطعہ پر غور کیجیے تو معلوم ہوتا ہے کوئی سادھو اپنے اکتارہ کو بجا بجا کر دنیا والوں کو ناپائداری دنیا کا سبق دے رہا ہے۔ لوگوں کو جھنجھوڑ جھنجھوڑ کر خواب غفلت سے چونکا رہا ہے۔ ساقی اور مطرب کی عشوہ طرازیوں اور توبہ شکن اداؤں کی عقدہ کشائی کر رہا ہے۔ صرف اس ایک قطعے کا جواب ہومر سے لیکر بالمیک، ملٹن سے لیکر ٹیگور کے دواوین میں نظر

نہیں آتا۔ یاروں نے اپنی شاعری کو پیغمبری کے قریب لانے کی کوشش کی مگر اے بسا آرزو کہ خاک شدہ۔ یا تو وہ نرے خشک ناصح بن گئے یا ایسے بھٹکے کہ شیطان نے مسکرا کر انھیں اپنی آغوش میں لے لیا۔

پیغمبری کے جہاں اور بھی بہت سے کام ہیں وہاں اس کی سب سے بڑی ڈیوٹی ہے کہ وہ انسان کی صحیح پوزیشن صاف کر دے۔ انسانی ذہن نے جب بلند پروازی کی — فرعون، نمرود، اور ہٹلر پیدا ہو گئے۔ اور جب انسان کے ذہن میں عجز غالب آیا تو سورج، چاند، پہاڑ، دریا، آگ پانی، سانپ اور پتھر مسجود انسان بن گئے۔ اور ان دونوں حیثیت میں انسان کے سب سے بڑے دشمن ابلیس کے ارادے کارفرما ہیں۔ پیغمبری نے اس غلط فہمی کا ازالہ کیا۔ انسان کی پوزیشن اشرف المخلوقات کی ہے۔ اس کا سر کسی کے سامنے جھک نہیں سکتا۔ یہ کسی کی بندگی نہیں کر سکتا۔ ساری کائنات اس انسان کی تابع ہے۔ آفتاب سے لیکر ذرے تک سب حضرت انسان کے لئے تخلیق ہوئے ہیں۔ تو پھر اس کی تخلیق کی غایت کیا ہے۔ مذہب نے کہا — تم صرف اللہ کی بندگی کیلئے پیدا ہوئے ہو۔ جب خدا نے قدوس کی نوری مخلوق نے اس کے آگے سجدہ کیا تو پھر کیا یہ زیب دیتا ہے کہ اب یہ اس قدر جاہل ہو جائے کہ اس کا سر اپنے سے کمتر مخلوق کے سامنے سجدہ کرے؟

غالب نے کہا ؎

سر پائے خم پہ چاہئے ہنگام بیخودی
رو سوئے قبلہ وقت مناجات چاہیے

اولاً تو تمھیں بیخود ہونا چاہئے۔ اور بیخودی کے لئے شراب کی ضرورت ہے۔ اور جب تم پر بیخودی طاری ہو گئی تو تمھیں سجدہ کرنا زیب دیتا ہے۔ وہ سجدہ کیا جس میں خمار نہ ہو۔ وہ عبادت کیا جو

عالم خودی میں ہو۔ ہاں تو اب تمہارا سر جھکے تو کہاں؟ جواب ہے۔ پائے خم پر۔
اس شعر میں لفظ خم شرح طلب ہے۔ خم اس مٹکے کو کہتے ہیں جس میں شراب بھری رہتی ہے۔
تو اب دیکھنا یہ ہے کہ غالب نے جان بوجھکر اس لفظ کا استعمال کیوں کیا۔ وجہ ظاہر ہے۔
غالب نے ایک شعر میں اپنی شراب کے معنی بیان کر دیئے ہیں اگر اس شعر کو ہم نظر کے سامنے رکھیں
تو اس شعر کا مفہوم باسانی سمجھ میں آسکتا ہے۔ وہ شعر ہے ؎

ہر چند ہو مشاہدۂ حق کی گفتگو
بنتی نہیں ہے بادہ و ساغر کہے بغیر

مشاہدۂ حق اپنے اندر وہ کیفیت اور سرور چھپائے ہوئے ہے کہ اس کی تمثیل اگر دنیا
کی کسی چیز سے دی جاسکتی ہے تو بقول غالب شراب ہی ہے۔ تو شراب ہی مشاہدۂ حق ہوئی
اور یہ مشاہدۂ حق ہمیں نصیب کہاں ہو سکتا ہے؟ ظاہر ہے وہ حق ہی کی ذات اقدس ہوگی۔
غالب نے اس ذات کی طرف اشارہ کیا دوسرا مصرع ؎ روسوے قبلہ وقت مناجات چاہیئے۔
صاف غمازی کر رہا ہے کہ خم سے مراد وہ خم نہیں جو شراب خانوں میں رکھے رہتے ہیں۔ اور
یہ قبلہ کیا چیز ہے؟ ظاہری نگاہیں اسے قبلہ سمجھتی ہیں مگر حقیقت نگر نظریں اسے قبلہ نہیں بلکہ
قبلہ نما سمجھتی ہیں۔ ہنگام بیخودی جس پائے خم پر غالب نے سر رکھنے کو کہا حقیقت میں
انسان کا مسجود وہی ہے۔ مگر یہ وہ مسجود نہیں جو ادراک اور فہم انسانی میں آجائے ؎

ہے پرے سرحد ادراک سے اپنا مسجود
قبلہ کو اہل نظر قبلہ نما کہتے ہیں

یہ ایک حقیقت ہے جس کی طرف ہر نبی اور رسول نے رہنمائی کی۔ مگر مشکل تو یہ ہے کہ اتنا سمجھ لے

کے باوجود انسان اپنی تخلیق پر کبھی غور نہیں کرتا۔ دنیا کے باریک نکتوں کی گتھی سلجھائی جاتی ہے اور غور نہیں کیا جاتا تو صرف اپنی ہستی پر۔ جس کا نتیجہ افراط اور تفریط کی صورت میں ظاہر ہوا کرتا ہے۔ انسان کو اگر صرف اپنی انسانیت کا احساس ہو جائے تو بہت سی گتھیاں آپ ہی آپ سلجھ جائیں گی۔ مگر اس کا احساس اتنا آسان نہیں جتنا سمجھا جاتا ہے۔ حالانکہ کائنات کا ذرہ ذرہ انسانی ذہن کو اس کی طرف مبذول کرتا رہتا ہے۔ اور اس معاملے میں ؎

اہل بینش کو ہے طوفان حوادث مکتب

لطمۂ موج کم از سیلیٔ استاد نہیں

مگر پھر بھی انسان انسان نہیں بنتا۔ وہ بننے کو خدا بن جاتا ہے۔ یعنی خدائی کا دعویٰ کر بیٹھتا ہے۔ اور نہیں بنتا ہے تو انسان۔ اس کے نزدیک دنیا کے سارے کام سہل ہیں۔ وہ اپنے عقل کو بروئے کار لاکر شعاع آفتاب کو بھی قید کر لیتا ہے۔ مگر انسان بن جانا اس کی نظر میں ایک ایسا مسئلہ ہے جو ابتک لاینحل ہے۔ غالب نے اظہار عجز ان لفظوں میں کیا ہے ؎

بسکہ دشوار ہے ہر کام کا آساں ہونا

آدمی کو بھی میسر نہیں انساں ہونا

مگر اس کا مطلب یہ نہیں کہ ہم اس تگ و دو ہی سے باز آجائیں۔ ہم جب انسان پیدا ہوئے ہیں تو ہمیں انسان ہی بن کر رہنا ہے، انسان بننے کی کوشش کرتے رہنا ہے۔ ؎

نفس نہ انجمن آرزو سے باہر کھینچ

اگر شراب نہیں انتظار ساغر کھینچ

ورنہ یہ انتظار ایک دن ہمارے سامنے مطلوب کو کھڑا کر دیگا۔ اگر کسی چیز کی طلب صادق ہے اور

اس طلب میں تڑپ بھی ہے تو پھر یہ بعید از قیاس نہیں کہ ایک دن وہ شے حاصل نہ ہو جائے۔ اس لئے کہ یہی انتظار رفتہ رفتہ عشق بن جاتا ہے اور پھر عشق کی رہنمائی میں ایک انسان وہ وہ منزلیں طے کر لیتا ہے جہاں عاشق و معشوق آمنے سامنے ہوتے ہیں۔ یعنی جس حاصل کی سعی پیہم ہوتی ہے وہ حاصل نظروں کے سامنے ہوتا ہے۔ اس عشق کی ابتدا ہوتی تو یوں ہے کہ عالم خندہ زن ہوتا ہے اور لوگ اسے خلل دماغ کہنے لگ جاتے ہیں ؎

بلبل کے کاروبار پہ ہیں خندہائے گل
کہتے ہیں جس کو عشق خلل ہے دماغ کا

مگر یہی عشق جب رگ و پے میں سرایت کر جاتا ہے اس وقت عاشق کہہ اٹھتا ہے ؎

عشق سے طبیعت نے زیست کا مزا پایا
درد کی دوا پائی درد بے دوا پایا

لیکن یہ عشق ہر کس و ناکس کو میسر نہیں ہوتا ؎

دھمکی میں مر گیا جو نہ باب نبرد تھا
عشق نبرد پیشہ طلبگار مرد تھا

حسن کو بے نقاب دیکھنے کی تمنا کسے نہیں۔ مگر یہ وہ منزل ہے جہاں تک پہنچنے کے لئے ہزاروں کٹھنائیاں اور بے شمار مشکلات کا مقابلہ کرنا پڑتا ہے۔ کبھی ساقی بجلوہ دشمن ایمان و آگہی سامنے آجاتا ہے اور کبھی مطرب منغمہ رہزن تمکین و ہوش کی صورت میں جلوہ گر ہو کر راستہ روک لیتا ہے۔ کبھی دنیا اپنی ساری رعنائیوں کے ساتھ اپنی طرف بلاتی ہے۔ کبھی انسان کی خودی اسے راہ سے بے راہ کر دیتی ہے۔ در پردہ یہ سب دھمکیاں نہیں تو اور کیا ہیں۔

غالب نے دنیا والوں کو اس کی طرف متوجہ کیا اور اپنی مثال دیکر یہ سمجھایا کہ بے شک تمہاری نگاہیں اس لیے ہیں کہ محبوب کی قدرتِ کاملہ کا معائینہ کرو مگر اس کے معنی یہ نہیں کہ انھیں لوازماتِ دنیا ہی کو اپنا دل سونپ دو۔ اپنا ایمان اتنا مضبوط رکھو کہ ہزاروں رنگینیاں ہی کیوں نہ نظروں کے سامنے آجائیں مگر تمہارا دل ان کی طرف ہرگز راغب نہ ہو۔ ؎

ایماں مجھے روکے ہے جو کھینچے ہے مجھے کفر
کعبہ میرے پیچھے ہے کلیسا میرے آگے

؟ اس لیے کہ ؎

رہا گر کوئی تا قیامت سلامت
پھر اک روز مرنا ہے حضرت سلامت

مرنے سے مطلب یہ ہے کہ جناب ایک روز آپ کو کسی کے دربار میں تو حاضری دینی ہی ہوگی اس وقت آپ کیا جواب دیں گے۔ دنیا لاکھ اپنی عشوہ گری دکھلائے، ہزار توبہ شکن انگڑائیاں لے مگر انسانیت کا تقاضا ہے کہ انسان مرجائے گر دنیاوی حسن کا دلدادہ نہ ہو۔ ؎

دہن شیر میں جا بیٹھیے لیکن اے دل
نہ کھڑے ہو جیے خوبانِ دل آزار کے پاس

غالب نے پند و نصیحت کی مگر شاعری کی زبان میں، کبھی تو اس نے اپنے آپ کو سمجھایا ہے اور کبھی دنیا والوں کو مخاطب کیا ہے۔ مگر دونوں حالتوں میں مقصد اسے نصیحت ہی کرنا ہے اور کبھی اس نے اپنی نصیحت کو ایک اصول بنا کر پیش کیا ہے۔ مثلاً جہاں اس نے اصولی

گفتگو کی ہے وہاں اس کے قلم نے اس قسم کے اشعار پیش کئے ہیں ؎

(۱) ؎ قیدِ حیات و بندِ غم اصل میں دونوں ایک ہیں
موت سے پہلے آدمی غم سے نجات پائے کیوں

(۲) ؎ غم اگرچہ جاں گسل ہے پہ کہاں بچیں کہ دل ہے
غمِ عشق اگر نہ ہوتا غمِ روزگار ہوتا ؏

(۳) ؎ غمِ ہستی کا اسدؔ کس سے ہو جز مرگ علاج
شمع ہر رنگ میں جلتی ہے سحر ہونے تک

(۴) ؎ رو میں ہے رخشِ عمر کہاں دیکھیے تھمے
نے ہاتھ باگ پر ہے نہ پا ہے رکاب میں

(۵) ؎ حسد سے دل اگر افسردہ ہے گرمِ تماشا ہو
کہ چشمِ تنگ شاید کثرتِ نظارہ سے وا ہو

مجھے ایک شعر اور یاد آ رہا ہے

حسد سزائے کمالِ سخن ہے کیا کیجے
ستم بہائے متاعِ ہنر ہے کیا کہیے

اور اس قسم کے بہت سے اشعار ان کے دیوان میں مل جاتے ہیں

اور جب وہ دنیا والوں کو مخاطب کرتے ہیں تو اندازِ کلام ذرا مولویانہ ہو جاتا ہے ؎

ہاں بھلا کر تیرا بھلا ہو گا ؏

اور درویش کی صدا کیا ہے

یہ شعر صاف ترجمہ ہے ارشاد نبوی کا ارحم ترحم۔

لیجئے اور سنئے ؎

نہ سنو گر برا کہے کوئی
نہ کہو گر برا کرے کوئی
روک لو گر غلط چلے کوئی
بخش دو گر خطا کرے کوئی

اے دل نا عاقبت اندیش ضبط شوق کر
کون لا سکتا ہے تاب جلوۂ دیدار دوست

نغمہ ہائے غم کو بھی اے دل غنیمت جانئے
بے صدا ہو جائے گا یہ ساز ہستی ایک دن

زنار باندھ سبحۂ صد دانہ توڑ ڈال
رہرو چلے ہے راہ کو ہموار دیکھکر

اور جن اشعار میں غالب نے اپنے آپ کو مخاطب کیا ہے ان کی کیفیت ہی کچھ اور ہوتی ہے ملاحظہ ہوں چند اشعار ؎

یہ کہاں کی دوستی ہے کہ بنے ہیں دوست ناصح
کوئی چارہ ساز ہوتا کوئی غمگسار ہوتا

بندگی میں بھی وہ آزادہ و خود بیں ہیں کہ ہم
الٹے پھر آئے در کعبہ اگر وا نہ ہوا

فائدہ کیا سوچ آخر تو بھی دانا ہے اسد
دوستی ناداں کی ہے جی کا زیاں ہو جائیگا

غالب بُرا نہ مان جو واعظ برا کہے
ایسا بھی کوئی ہے کہ سب اچھا کہیں جسے

حسن فروغ شمع سخن دور ہے اسد
پہلے دل گداختہ پیدا کرے کوئی

کہتے ہوئے ساقی سے حیا آتی ہے ورنہ
ہے یوں کہ مجھے دردِ تہِ جام بہت ہے

نے تیر کماں میں ہے نہ صیاد کمیں میں
گوشے میں قفس کے مجھے آرام بہت ہے

غرض غالب کا مطالعہ ہم جس زاویہ نگاہ سے بھی کریں، اور اس کے جس پہلو کو بھی دیکھیں ہم یہ کہنے پر مجبور ہیں کہ اس کی شاعری پیغمبری کا جزو ہے۔ اس قسم کا شاعر صدیوں گذرنے کے بعد ہی پیدا ہوتا ہے۔ اے غالب تری شاعری الہامی شاعری ہے اور صرف تیرے ہی دیوان کو یہ حق پہنچتا ہے کہ وید مقدس کے پہلو بہ پہلو جگہ پائے۔

تصورِ فنا

مختلف خیال کے لوگوں نے فنا کے مختلف معنی لئے ہیں طبقہ مادیئین جس نے روحانیت کا یک قلم انکار کر دیا کہتا ہے کسی چیز کی ظاہری شکل و صورت جو ہمیں نظر آ رہی ہے وہ اپنی ارتقار کی آخری حد پر پہنچکر اپنی موجودہ شکل و صورت کو ناپید کر دیتی ہے۔ اور اسی حالت خاص کا نام فنا ہے مگر اس مخصوص شکل کی عدم موجودگی اس چیز کی فنا نہیں۔ زیادہ سے زیادہ ہم یہی کہہ سکتے ہیں کہ اس خاص چیز نے اپنا قالب بدل دیا۔ قالب کے فنا ہوتے ہی وہی چیز ایک دوسری شکل میں نمودار ہوتی ہے۔ اور ہمچنیں مسلسل۔ اس طبقے نے مادہ ہی کو ازلی سمجھ رکھا ہے وہ یہ کہ ہر چیز ابد تک برقرار رہے گی۔ یعنی کائنات کی ہر چیز ابدی ہے۔ لہٰذا اگر فنا کوئی چیز ہے تو وہ نام ہے صرف شکلوں کے تغیرات کا۔ جیسے ہم آم کی ایک گٹھلی کہتے ہیں۔ اگر ہم اسکی حقیقت پر نگاہ ڈالیں تو اس کے اندر ہمیں ایک بڑا تنومند درخت نظر آئے گا اور صرف ایک ہی نہیں ایسے ایسے لاکھوں کروڑوں درخت اسی آم کی ایک گٹھلی میں طوفانوں کے تیز و تند جھونکوں کے سامنے اپنے برگ و بار کے ساتھ کھڑے نظر آئیں گے مگر ان کا ظہور اس وقت تک نہیں ہو سکتا جب تک اس گٹھلی کی موجودہ شکل و صورت برقرار ہے۔ اس گٹھلی کو زمین میں گاڑ دو اربعہ عناصر اسے اپنی آغوش میں لیکر اسے درس فنا دیں گے اور جونہی اس گٹھلی پر یہ مخصوص کیفیت گذری کہ گٹھلی کا نام و نشان ختم اور اب اس کی جگہ ایک نئی چیز ہی نظر آنے لگی۔ مگر جو چیز نظر آئی وہ کوئی خارجی شے تو نہ تھی بلکہ پنہاں تھی اس آم کی ایک بیج میں۔

اسی ایک مثال پر دنیا کی ساری مثالیں قائم کی جا سکتی ہیں۔

راز دار فنا غالب نے اس نظریے کو اپنایا تو ضرور مگر اس نے اس عام ڈگر پر چلنے سے انکار کر دیا اس نے اپنی شاہراہ الگ بنائی فلسفی بائیں سے داہنی طرف چلے مگر غالب داہنی جانب سے بائیں اور چلا۔ اس نے کہا ؎

میری تعمیر میں مضمر ہے صورت اک خرابی کی
ہیولی برق خرمن کا ہے خون گرم دہقاں کا

اور وہ صرف اسلئے کہ مادئین طبقے کا نظریہ قاعدہ کلیہ ہرگز نہیں بن سکتا۔ مادئین طبقے کے نظریے کے اندر سب سے بڑی خرابی یہ ہے کہ اس نظریہ کا اطلاق افراد پر تو کسی حد تک ہو سکتا ہے مگر جماعت پر قطعی لاگو نہیں۔ فرض کیجئے آم کی جس گٹھلی کی مثال ہم نے اوپر دی ہے اگر اس بیج کو ہم زمین میں نہ گاڑیں تو کیا اس گٹھلی سے ہم اس کی توقع کر سکتے ہیں کہ آپ ہی آپ اس میں سے آم کا ایک درخت نکل آئے؟ اور اگر ایسا نہیں ہو سکتا تو پھر اب دوسری کونسی راہ رہ جاتی ہے بجز اس کے کہ وہ گٹھلی اپنی شکل، ہیئت اور فطرت غرض ہر لحاظ سے فنا ہو جائے۔ اب جس نوع کو ہم آم کہہ رہے ہیں اسکے اجزا یوں ہی فنا ہوتے رہیں گے۔ تو کیا ایک دن وہ نہیں آ سکتا جب صفحۂ ہستی سے اس نوع کا خاتمہ ہی ہو جائے؟ محققین نے بہت سے ایسے جانوروں کے پتے لگائے ہیں جو آج سے چند ہزار سال پہلے تک تو دنیا میں پائے جاتے تھے مگر آج ان کا نام و نشان تک نہیں۔ شری جواہر لال نہرو نے اپنی اندرا کے پاس جو خطوط لکھے ہیں، ان میں آپ نے اس نظریے پر کافی روشنی ڈالی ہے یہ خطوط اب کتاب کی شکل میں شائع ہو کر سکولوں کے نصاب میں داخل ہو گئے۔ اس کتاب میں قابل مؤلف نے ان بہت سے جانوروں کی تصویریں بھی شائع کی ہیں، جنکا ذکر نہرو جی نے کیا ہے اور اب

وہ شخص ناپید ہے ~ خاک کا رزق ہے وہ قطرہ کہ دریا نہ ہوا

اب یہاں ایک بہت بڑا سوال پیدا ہو جاتا ہے کہ کیا ایک نوع کی فنا اس بات کی دلیل نہیں ہو سکتی کہ وہ نوع فنا ہو کر کسی دوسری نوع میں جلوہ گر ہو جائے؟ اگر ہم سے کوئی پوچھے تو ہم اس کا جواب اثبات میں دیں گے مگر مادئین فلاسفہ اس سوال پر خاموش ہیں۔ ان کے ذہن میں یہ بات آ ہی نہیں سکتی کہ کوئی نوع صفحہ ہستی سے یک لخت معدوم کیسے ہو سکتی ہے۔ مشاہدہ جو مادئین فلاسفہ کی اصل الاصول ہے اگرچہ ہزاروں نظریں ہمارے سامنے پیش کرتا ہے مگر مادئین اس کا انکار صرف اس لئے کرتے ہیں کہ اس کا اقرار عین قیامت کا اقرار ہے اور قیامت کے اقرار کے معنی ہوئے کہ مادئین نے در پردہ روحانیت کو تسلیم کر لیا۔

مگر ٹھیک اس کے برعکس روحانئین طبقے کا نظریہ ہے۔ اس طبقے نے مادہ کو بالذات کوئی شئے تسلیم نہ کیا۔ اس نے مادہ کو نہ ازلی سمجھا اور نہ ابدی اس نے اپنے نظریے کی عمارت ایک عقل کل یا بالفاظ دیگر ایک روح اعظم (پرماتما) کی بنیاد پر کھڑی کی۔ اس نے ایک اللہ کی تخئیل (conception) پیش کی اور کہا ہو الاول ہو الآخر یعنی اللہ باقی من کل فانی اگر بقائے دوام کسی ہستی کو ہے تو وہ صرف اللہ کی ذات ہے اور باقی ساری چیزیں آج یا کل فنا ہو کر رہیں گی۔ ہماری نظروں کے سامنے کائنات کی جو مختلف صورتیں نظر آ رہی ہیں ہر صورت میں وہی ایک عقل کارفرما ہے۔ وہی ایک روح جلوہ گر ہے۔ ذرہ سے لیکر آفتاب تک ہر شئے کے دل میں اسی ایک شاہد حقیقی کی روح حرکت کر رہی ہے۔ غالب نے بڑے بلیغ انداز میں اس حقیقت پر روشنی ڈالی ہے کہتا ہے ~ ہے کائنات کو حرکت تیرے ذوق سے

پرتو سے آفتاب کے ذرے میں جان ہے

روحانئین طبقہ جب فنا کا لفظ استعمال کرتا ہے تو ہرگز اس کا منشا یہ نہیں ہوتا کہ کسی چیز کی ظاہری شکل و صورت نیست و نابود ہوگئی۔ وہ اس فنا کو تو قانون قدرت ہی سمجھتا ہے۔ اس فنا سے کسی ذات یا کسی نوع کو مفر نہیں۔ اس فنا کو اگر بنظر تحقیق دیکھا جائے تو یہ فنا اپنے مرکز کیطرف پیچلنے کا ایک بہانہ ہے۔ جب صرف اللہ کو ہم نے باقی تسلیم کر لیا تو اس کائنات پر ایک وقت وہ بھی آکر رہیگا جب صرف اللہ ہی اللہ ہو گا۔ اور اس کے ماسوا ساری ہستیاں معدوم۔ معدوم اس صورت سے کہ گویا وہ تھیں ہی نہیں۔ غیر اللہ کی بقائے دوام کا اقرار ہو الآخر اور اللہ باقی کا عین انکار ہے۔ یہ فنا ہیں اور آپ کو رفتہ رفتہ ایک ایسی ہستی میں گم کرتی جا رہی ہے جو ہستی ہی ہمارا مخرج تھی۔ غالب نے اس فنا پر خامہ فرسائی کی مگر واللہ کتنے پتے کی بات کہہ دی۔ ایسے ٹھوس مضمون پر شاعری کرنا اور پھر شعریت کو بھی برقرار رکھنا قسم ذات واحد کی غالب ہی کا کام تھا۔ اس نے عالم کے گرد و پیش نظر ڈالی۔ حقیقت آئینہ کیطرح صاف ہو گئی۔

نظر میں ہے ہماری جادۂ راہ فنا غالب
کہ یہ شیرازہ ہے عالم کے اجزائے پریشاں کا

اس شعر کی جان لفظ شیرازہ ہے۔ اس لفظ کو نکال دو شعر بے معنی ہو جاتا ہے اس شعر کو رکھو دو شعر حقیقت بنجاتا ہے۔ کیا اس شعر کو ہم — اللہ باقی من کل فانی کی تفسیر نہیں کہہ سکتے؟

غرض مادئین طبقے نے جس فنا کا تصور پیش کیا اسکی اہمیت روحانئیں طبقے نے مطلق نہ دی۔

روحانئین طبقے نے کہا موتوا قبل ان تموتوا کا دوسرا نام فنا ہے۔ ہزاروں یونیوں کے چکر کاٹ لینے کے بعد اگر ہم نے نروان حاصل کیا تو کون سا کمال پیدا کیا۔ یہ تو عین منشائے ایزدی ہے آج نہ کل ہماری آتما اپنے پرماتما میں ملکر پرماتما بن ہی جائیگی ارے کمال تو یہ ہے کہ ہم اپنی روحانی

طاقتوں کو اتنا بلند، اتنا ارفع کر ڈالیں کہ عین حیات دنیوی ہی میں ہمیں نروان حاصل ہو جائے اگر ہم آسمان کی طرف انگلی اٹھا دیں تو چاند دو ٹکڑے ہو جائے۔ اگر ہم اپنے انگلیوں سے کہدیں کہ آبشار بن جاؤ تو اس آب زلال سے ایک دو نہیں ہزاروں بزرگان خدا چہ دشمن چہ چہ دوست سب سیراب ہو جائیں اور اپنی اپنی مشکوں میں آئندہ کے لئے پانی بھی جمع کر رکھیں اگر درختوں سے کہدیں کہ تم حرکت میں آجاؤ تو وہ درخت زمین کو چیرتے پھاڑتے ہمارے قریب آجائیں۔ نروان اس کا نام ہے۔ مکتی اسے کہتے ہیں۔ ذرے کے اندر آفتاب کی ساری خصوصیات پیدا ہو جاتی ہیں شبنم شبنم نہیں بلکہ بحر ذخار کا قائم مقام بنجاتا ہے۔ اس کیفیت خصوصی میں ہوتا یہ ہے کہ آتما کا ایک سرا پرماتما سے جا ملتا ہے۔ آتما کی خواہش عین پرماتما کی خواہش ہوتی ہے۔ آتما جو کچھ بولتا ہے حقیقت میں وہ پرماتما کے ہی مدھر بول ہوتے ہیں اور ایک دن وہ آتا ہے جب پرماتما کو اعلان کرنے بنتا ہے کہ وما ینطق عن الھویٰ

ہستی ہماری اپنی فنا پر دلیل ہے
یاں تک مٹے کہ آپ ہم اپنی قسم ہوئے

غرض اس لمبی تمہید سے فنا کے صرف دو مفہوم آشکار ہوئے

الف —— مادہ فنا پذیر ہے۔

ب —— روح کی فنا عین حیات دنیوی میں روح اعظم میں مدغم ہو جانے کا نام ہے۔

حضرت غالب نے ان دونوں قسموں کی فنا پر اپنی الہامی زبان میں روشنی ڈالی ہے۔

جب سے اس دنیا پر انسان کی آبادی ہے اور کسی حقیقت کا انکشاف ہوا ہو یا نہ ہو مگر ہر دور اور ہر زمانے میں ایک حقیقت اپنی ساری وضاحتوں کے ساتھ نوع انسان پر ظاہر ہوتی رہی

کہ جو چیز آج پیدا ہوئی کل وہ مٹ گئی۔ صبح دم جو کلی کھلی ہے وہ اپنی ساری رعنائیاں دکھلا کر شام تک مرجھا گئی، ابھی چمنستان لہلہا رہا تھا ابھی بادسموم کے صرف ایک تیز و تند جھونکے نے اسے بیاباں میں تبدیل کر دیا۔ ابھی صبح بہاراں مسکرا رہی تھی ابھی شام غریباں رو پڑی۔ جہاں چند گھنٹے پیشتر بہار انگڑائیاں لے رہی تھی، وہاں اب خزاں کا دار دورہ ہے۔ ماں کی گود میں ایک پھول سا بچہ مسکرا رہا تھا اور پھر کچھ دنوں بعد دیکھو وہی بچہ جوان رعنا بنا، پھر اس پر ضعیفی آئی اور پھر......... چشم زدن میں وہ اپنے احباب کے کندھوں پر سوار گور غریباں کی طرف چلا جا رہا ہے۔ اس حقیقت کا انکشاف کچھ فلسفیوں نے نہ کیا۔ مذہبی علمبرداروں نے اس پر روشنی نہ ڈالی۔ بلکہ فطرت نے اس منظر کو ہمیشہ اہل نظر کے سامنے پیش رکھا۔ ستجگ سے لیکر کلجگ تک جاہل سے لیکر عالم تک، فلسفی اور سائنس داں نے دیکھا کہ موت کسی کو چھوڑتی نہیں اسکی زد میں رشی، منی، نبی اور رسول ولی اور سادھو، بدکار اور متقی سب ہی آجاتے ہیں۔

مگر سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا یہ موت دفعتاً آجاتی ہے؟ مذہب نے کہا ہاں۔ اور ہاں اس نے صرف اس لئے کہا کہ موت جس کیفیت سے تعبیر ہے وہ کیفیت جب کسی پر گذرتی ہے تو واقعی صرف ایک ہچکی موت اور زندگی کے درمیان حائل رہتی ہے یا دوسرے لفظوں میں یوں کہیئے قفس عنصری سے جونہی طائر روح نے پرواز کی کہ ہم نے کہا موت واقع ہو گئی اور اس موت کو ناگہانی ہونا ہی ہے۔ غالب نے اسی موت کو ایک جگہ مخاطب کر کے کہا ہے۔

غفلت کفیل عمر و اسد ضامن نشاط
اے مرگ ناگہاں تجھے کیا انتظار ہے

مگر کیا ہم اسی موت کو اپنی فنا کہہ سکتے ہیں۔ پچھلی کسی نشست میں ہم نے کہا ہے کہ موت

دہریوں کے ہاں فنا کے معنی میں مستعمل ہو تو ہو مگر اہل مذہب نے اس موت کو ہرگز فنا نہ کہا۔ فنا جس چیز کو کہتے ہیں وہ موت کی شکل میں ہرگز نہیں آتی۔ بلکہ عالم کون و مکاں میں کسی چیز کے ظہور کے ساتھ ہی فنا بھی اپنا کام کرنی لگتی ہے۔ فنا کے آہنی شکنجے فرد اور جماعت پر یکساں پڑتے ہیں۔ فنا کی نظر میں ذرہ اور آفتاب دونوں برابر ہیں۔ اس مسئلے پر روشنی ڈالتے ہوئے غالبؔ نے کہا ہے

ہیں زوال آمادہ اجزا آفرینش کے تمام
مہر گردوں ہے چراغ رہگزار باد یاں

ہے اس عالم میں کوئی ایسا بھی فرد جو یہ کہدے کہ آفتاب کب سے ہے؟ آفتاب کی عمر کا اندازہ کوئی لگا نہیں سکتا۔ مگر اتنا ہر شخص کہہ سکتا ہے کہ ماہر فلکیات نے اب تک جو علم حاصل کیا ہے اس کا نچوڑ بھی اسی قدر ہے کہ سورج ایک کرۂ نار ہے جو دیگر تمام کروں سے لکھو کھا گنا بڑا ہے بلکہ اس کے ماتحت کائنات میں ایک ایسا نظام بھی ہے جس میں سورج کی حیثیت کبھے کی ہے اور باقی تمام دنیائیں، سیارے اور ثوابت یا تو اس کے چوگرد طواف کر رہے ہیں یا اس کے زائرین ہیں۔ مگر غالبؔ نے کہا اس سورج کی عظمت خواہ از روئے مذہب کچھ ہو خواہ از روئے علم نجوم کچھ۔ لیکن اگر وہ کسی کی آفرینش ہے (اور ضرور ہے) تو اس کے اندر کے اجزا زوال آمادہ ہیں۔ جلد یا دیر سے اس سورج کو بھی ایک دن فنا ہو جانا ہے۔ ہر چیز کے اجزا ہر لحظہ کچھ نہ کچھ فنا ہو رہے ہیں۔ اس میں ذرے اور آفتاب کی قید نہیں۔ غالبؔ کی حقیقت بین نظر نے اتنے بڑے کرۂ نار کو رہگزار باد کا ایک چراغ کہدیا۔ اگر غالبؔ اپنے پہلے مصرع میں رہگزار باد کا لفظ نہ لاتا تو ایک شبہ کی گنجائش رہ جاتی اور وہ یہ کہ پہلے مصرع کا انداز بیان عمومی ہے جس سے یہ معنی مترشح ہوتے ہیں کہ اجزائے آفرینش زوال آمادہ ہیں تو پھر موت کو ناگہانی نہ ہونا چاہئے

شمع کو اگر فانوس میں رکھ کر کسی ایسے مقام پہ فانوس کو رکھ دیں جہاں تیز ہوا نہ چلتی ہو تو شمع ختم ضرور ہوگی مگر جب تک اس کے اندر آخری قطرۂ روغن ہوگا اسی وقت تک شمع جلتی رہیگی۔ لیکن اس کے برعکس اگر اسی شمع کو ہم اٹھا کر سڑک پر رکھ دیں جہاں یہ معلوم نہیں کہ ہوا کی رفتار کس وقت کم اور کس وقت تیز ہو جاتی ہے وہاں شمع کا موم پگھل پگھل کر فنا ہوتا رہیگا مگر قطعی طور سے ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ شمع آخری قطرۂ روغن تک ضرور جلے گی۔ ممکن ہے نصف تک جلنے سے پیشتر ہی ہوا کا ایک جھونکا اسے ہمیشہ کے لیئے خاموش کر دے۔ غالب کے سوجھ کی داد دیجیے کہ وہ جو لفظ بھی لاتا ہے بیکار نہیں۔ اور بقول اسی رند خراباتی کے

گنجینۂ معنی کا طلسم اس کو سمجھیے ؎
جو لفظ کہ غالب مرے اشعار میں آوے

اس لفظ رہگذار باد سے یہ بات صاف ہو گئی کہ اگرچہ اجزائے آفرینش زوال آمادہ ہیں مگر حیات شمسی کا چراغ کس وقت گل ہو جائیگا۔ اس کا تعین کرنا محال ہی نہیں غیر ممکن ہے اور یہی حالت کائنات کی ہر چیز کی ہے خواہ وہ چیز غیر ذی روح ہو خواہ ذی رُوح۔

اب اگر یہ بات طے ہے کہ موت جب آئے گی اچانک تو ظاہر ہے زندگی کی ساری خوشیاں اسی موت ناگہانی کے دم سے ہے۔ ہم اپنی زندگی میں زیادہ سے زیادہ خوشیاں، مسرتیں عشرتیں کیوں حاصل کرنا چاہتے ہیں؟ غالب کہتا ہے صرف اس لیے کہ سب کے ذہن نے شعوری یا غیر شعوری طریقے سے اس مسئلہ کو سمجھ لیا ہے کہ موت اچانک آ جائے گی۔ اگر یہ موت نہ ہوتی تو پھر زندگی کے سارے عیش بیکار تھے۔ ساری محنتیں ضائع تھیں۔ بات اب بھی سمجھ میں نہ آئی۔ لیجیے اس کا شعر پڑھیے شاید آپ سمجھ لیں ؎

ہوس کو ہے نشاطِ کار کیا کیا
نہ ہو مرنا تو جینے کا مزا کیا!

اب ایک سوال اور رہ جاتا ہے کہ فنا کا محرک کون ہے؟ یہ سوال کچھ زیادہ ٹیڑھا نہیں، فنا کوئی خارجی شئے نہیں۔ زیست کے پیچھے ہی فنا ہے۔ کسی چیز کے ظہور کے معنی ہی یہی ہیں کہ وہ چیز اپنی فنا لیے ہوئے پیدا ہوئی ہے۔ جو ہستی کہ سبب ہے ظہور کا وہی ہستی فنا کا بھی سبب ہے۔ ظاہر ہے سمندر سے جو ابخرے پیدا ہوتے ہیں اسکی اس پیدائش میں حرارت شمسی کارفرما ہے اور یہی ابخرے کہیں بارش، کہیں بادل، کہیں پانی کہیں برف اور کہیں شبنم کی صورتوں میں جلوہ گر ہوتے ہیں۔ گویا ان مختلف صورتوں کا بانی سورج کی گرمی ہی ہے تو پھر کوئی وجہ نہیں کہ ان صورتوں کو فنا کرنے والی وجہ سورج نہ ہو۔ بالفاظ دیگر یوں سمجھیے کہ شبنم کو جس چیز نے شبنم بنایا وہ سورج کی گرمی ہے اور یہی گرمی شبنم کی فنا کا باعث بھی ہے۔ ہمارا وجود بھی کسی شاہد جمال کی چشم کرم کا مرہون منت ہے۔ جس طرح ہماری ظاہری نگاہوں کے سامنے نظام شمسی کے کرشمے روز اپنی اٹھکھیلیاں دکھاتے رہتے ہیں۔ اسی طرح ایک اور باطنی نظام ہے جسے دیکھنے کیلیے نگاہ باطن ہی کی ضرورت ہے۔ اسی نظام باطن کا کرشمہ ہے جس نے کائنات کا یہ گھروندہ کھڑا رکھا ہے کونین کا ظہور کسی معشوق ہی کے لطف و کرم کا ظہور ہے روز نئے نئے گل کھلتے ہیں۔ ہزاروں دلفریب مناظر نظروں کے سامنے ہمہ وقت اپنی بہاریں دکھلا رہے ہیں کیا یہ سب کسی کے جمال کا پرتو نہیں؟ یقینی کوئی معشوق ہے اس پردہ زنگاری میں۔ اسکی نظر عنایت کا نتیجہ ہمارا وجود ہے اور ہماری فنا بھی اسکی چشم کرم کا محتاج ہو غالب نے بڑے لطیف پیرایہ میں کہا ہے

پرتو خور سے ہے شبنم کو فنا کی تعلیم
ہم بھی ہیں ایک عنایت کی نظر ہونے تک۔

اس شعر کے دونوں مصرعوں میں اگرچہ فنا کی عقدہ کشائی کی گئی ہے مگر حقیقت یہ ہے کہ راز پنہاں کی طرف اشارہ بھی در پردہ کر دیا گیا ہے کہ جو ہستی باعث ظہور دوئی ہستی فنا کا سبب بھی ہو مگر اس فنا کا یہ مطلب نہیں کہ مادہ کی فنا کے ساتھ ساتھ وہ شے بھی بذات خود ہمیشہ کے لئے مٹ گئی۔ اس فنا نے عین بقا کا کام کیا۔ وہ شے مٹنے کو مٹی مگر ایک نئی زندگی لیکر پھر نمودار ہو گئی۔ اور یہ زندگی یقیناً پہلی زندگی سے ارفع و اعلیٰ ہوگی، اور یہی تو کاروبار فطرت ہے۔ اگر فطرت اس عمل پر کاربند نہ ہو، اگر اس قانون پر سختی سے عمل پیرا نہ ہو تو پھر دنیا کا نظام درہم برہم ہو جائے۔ دنیا کی ساری مخلوق پر نگاہ ڈالو وہ دو چیزوں سے مرکب نظر آئیگی ایک مادہ اور ایک وہ قوت جو اس مادہ کو حرکت میں لا رہی ہے۔ اس قوت کو مادئین نے فطرت کہا اور اسی کو روحانیین نے روح سے تعبیر کی۔ اگر ہم لفظی نزاع بیچ میں حائل نہ کریں تو دونوں طبقے کا مفہوم قریب قریب یکساں ہی نظر آئے گا۔ پھول کو جس نام سے پکارو وہ پھول ہی ہے۔ مگر سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ وہ قوت خود بخود پیدا ہو گئی یا اس قوت کا بھی کوئی خالق ہے۔ اگر اس سوال کا سلسلہ ہم یونہی جاری رکھیں تو بات زیادہ سے زیادہ پیچیدہ ہوتی جائیگی جو یقیناً ہمارے اس مضمون کا عنوان نہیں۔ ہاں دبی زبان ہم اتنا عرض ضرور کر دینا چاہتے ہیں کہ جو قوت ذی عقل اور صاحب ارادہ نہ ہو وہ ہرگز اس پر قدرت نہیں رکھ سکتی کہ اس کی ذات سے کوئی باشعور اور اہل الرائے ہستی کی تخلیق ہو۔ ہم اپنے مضمون کا رخ دوسری طرف پھیرنا نہیں چاہتے۔ ہمیں تو غالب کے صرف تصور فنا سے بحث ہے۔

انسان زمانہ دراز سے دیکھ رہا ہے کہ قانون فطرت نے ساری کائنات میں ہم آہنگی۔ یک رنگی اور یکسانیت۔ اس بچے تلے انداز میں قائم رکھی ہے کہ فطرت کے ہر اندازے کو انسان نے قاعدہ

کلیہ مان رکھا ہے۔ ایک جاہل انسان سے بھی پوچھو تو یہی کہے گا کہ سورج مشرق سے طلوع ہوتا ہے۔ آگ کا خاصہ جلانا ہے تشنگی پانی سے رفع ہوتی ہے۔ ماہر نجوم سے دریافت کرو تو سو سال بعد ہونے والے چاند گہن کی تاریخ، وقت، لمحہ کا ٹھیک ٹھیک پتہ دیدینگے۔ آخر کیوں؟ وجہ صرف یہی ہے کہ فطرت نے جس سیارے کی جو چال مقرر کر رکھی ہے اس میں سرمو فرق نہیں۔

مگر ایسا ہوتا کیوں ہے؟ ایک پھول کو ہم دیکھتے ہیں وہ کھلا اور پھر مرجھا گیا۔ مگر فوراً اس کے بغل ہی میں ایک دوسرا غنچہ مسکرا اٹھا۔ ایک طرف ایک بڈھے نے جان دی اور دوسری طرف سے کسی نئے زائیدہ بچے کے رونے کی آواز آئی۔ ایک جماعت فنا ہوئی اور اس کی جگہ فوراً دوسری نے لی۔ ایک قوم نے دوسری قوم کے لیے جگہ خالی کر دی۔ حکومت برطانیہ نے اپنی عمارت سلاطین مغلیہ کے کھنڈروں پر کھڑی کر دی۔ غرض دنیا کے اس کاروبار کے پیچھے آیا کسی صاحب عقل ہستی کا ہاتھ ہے یا یہ سب چیزیں خودبخود یونہی ظہور پذیر ہوتی رہتی ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کسی کا ظہور صرف کسی کی فنا ہی کا منتظر تھا دہری ایسے موقع پر اپنا پیٹنٹ نسخہ بتلادیں گے مگر حضرت غالب، وہ رند خراباتی جس کے ایک ایک جام پر فردوس کی سلسبیلیں نثار جس کی ہر لغزش مستانہ پر زاہد تارک الدنیا کی عبادت صد سالہ قربان، اس نے اس سارے کارناموں کے درپردہ زمانے کے ان سارے تغیرات کے پیش نظر اپنے محبوب ہی کے دست ناز کو کارفرما دیکھا۔ مگر اس کی باطن بیں نگاہ نے اس بازیچہ اطفال کو حقیقت کبھی نہ سمجھا۔ اس نے مادی الٹ پھیروں کو وہم سے زیادہ اہمیت نہ دی۔ اس نے کہا چمن میں جو پھول کھلا ہے اسے حقیقت میں کسی کے جمال زہد شکن کی تمنا نے دید ہے۔ مگر اس مادی لباس میں وہ جمال دلفروز نظر کاہے کو آنے لگا۔ ایک پھول کو کھلا ہوا دیکھ کر وہ پھول جو عدم میں ہے یہ سمجھتا ہے اس پھول نے شاید اپنے محبوب کا دیدار حاصل کر لیا اور اسی

دھوکے میں وہ بھی چلا آتا ہے۔ ان فریب خوردہ پھولوں کو کیا معلوم کہ اس دنیا میں اس کا دیدار غیر ممکن ہے۔ مگر یہ پھول ہیں کہ عدم سے یکے بعد دیگرے دوڑے چلے آ رہے ہیں اور جب اس دنیا میں ان سب نے آنکھ کھولی تو ان کی تمنائیں مر چکی تھیں۔ وہ صرف دھوکا کھا کر رہ گئے ذرا غالبؔ کے انداز بیان کو تو ملاحظہ فرمائیے۔ اس دقیق نکتے کو اس نے کس خوبصورتی سے صرف دو مصرعوں میں ادا کر دیا ہے ؎

تیرے ہی جلوے کا ہے یہ دھوکا کہ آج تک
بے اختیار دوڑے ہے گل در قفائے گل

اس شعر کے لفظ "جلوہ" اور "دوڑے" ہے، سے اس راز کی عقدہ کشائی ضرور ہو جاتی ہے کہ کہ اس دنیا میں آنے کا مقصد وہ نہیں جو یہاں آنے کے بعد ہو جاتا ہے۔

اسی مفہوم کو غالبؔ نے اپنے فارسی کے ایک شعر میں بھی ادا کیا ہے، ہاں انداز بدلا ہوا ہے ؎

تا گل برنگ و بوئے کہ ماند کہ در چمن
گل در پس گل آمدہ در جستجوئے گل

* * *

اوپر جو بحث گزری اس کا تعلق صرف مادے کی فنا سے تھا مگر غالبؔ نے اس فنا کی کوئی خاص اہمیت نہ دی۔ میخانہ عشق کے بادہ خوار کو تعلقات دنیوی کا کب ہوش رہتا ہے۔ جس خوش نصیب کے ہاتھوں میں ساقی خوش جمال نے اپنے دست خاص سے شراب کی پیالیاں عنایت کی ہوں اسکی نگاہ تشنہ دید کو لوازمات میکدہ سے کیا نسبت۔ جس کے سامنے محبوب بے نقاب آ چکا ہو اسے اپنے تن من کا کیا ہوش۔ اس کی تو ایک ادھر صرف ایک غرض ہوتی ہے کہ وہ اپنے محبوب کی

ذات میں فنا ہو جائے تاکس نہ گوید بعد ازیں من دیگرم تو دیگری کیوں؟ بھیجے غالب ہی کی زبانی سنئے ؎

جو ہوا غرقۂ مے بخت رسا رکھتا ہے
سر سے گذرے پہ بھی ہے بال ہما موج شراب

یہ موج شراب بال ہما کا فنکشن (Function) کرنے لگتی ہے۔

غالب کا عشق بڑھتا گیا، محبت جنون کی شکل اختیار کرتی گئی مگر شاہد مطلق کا دیدار محبوب حقیقی کا وصل گڑیا گڑیوں کا کھیل تو نہیں کہ جب چاہا ایک گھروندہ بنا لیا۔ اس میدان میں وہ وہ پاپڑ بیلنے پڑتے ہیں کہ بڑے بڑے بہادروں کے چھکے چھوٹ جاتے ہیں۔ انجن کے چلانے کیلئے گرم پانی کی ضرورت نہیں۔ پانی کا درجۂ حرارت جب تک ابال (Boiling point) کے نقطے سے اوپر نہ جائے انجن چلنے والی نہیں۔ صرف گریباں صد چاک اور دامن تار تار سے درجۂ فنا حاصل ہونے والا نہیں۔ جب تک دل چاک چاک نہ ہو، جگر کے ہزاروں ٹکڑے نہ ہو جائیں محبوب کی ایک ہلکی سی جھلکی بھی نصیب نہیں ہو سکتی۔ یہ وہ مقام ہے جہاں پہنچنے سے پہلے اپنی ہستی مٹا ڈالنی پڑتی ہے۔ آنسو کی قدر و قیمت اس وقت تک نہیں جب تک اس میں خون آمیزی کیا لخت پارہائے جگر نہ ہوں ؎

تب ناز گرانمایگئ اشک بجا ہے
جب لخت جگر دیدۂ خوں بار میں آوے

یہ وہ منزل ہے جہاں اپنی جان عزیز کی قربانی ہی شرط اولین ہے۔ جان کی قربانی کا تعلق خون اور گوشت سے نہیں بلکہ اپنی جان کو جان آفریں کے حوالے کر دینا ہے۔ قربانی کا لفظ اس لیے استعمال کیا کہ یہ لفظ اپنے لغوی معنی کے علاوہ جو اصطلاحی مفہوم اپنے اندر پوشیدہ رکھتا ہے وہ مفہوم نہایت

ہی بلند حد سے زیادہ پاک اور مقدس ہے۔ اپنی عزیز ترین شے کو اپنے کسی دوست یا کسی اور کی خدمت میں یوں نذر کرنا کہ دل پر ذرا بھی گرد کدورت نہ ہو۔ کوئی پریشانی کوئی جھجک اور کسی قسم کا رنج و افسوس نہ ہو۔ اور ظاہر ہے جان سے بڑھ کر اور کون سی شے ہے جو ایک انسان کو عزیز ہو سکتی ہے۔ مگر یہ قربانی رائگاں نہیں جاتی۔ چھن جانے سے تو بہرحال سونپ دینا بہتر ہے۔ جب یہ ہمیں قطعی طور سے معلوم ہے کہ یہ جان آج نہ کل ضرور ہی کسی کے پاس جائے گی تو پھر کیوں نہیں ہم ہی پہل کریں۔ ہمارے پہل کرنے کا یہ مقصد نہیں کہ ہم خودکشی کرلیں یہ تو عین قانون فطرت سے غداری ہے۔ اور تمہیں معلوم ہے ہر جرم بخشا جا سکتا ہے مگر بغاوت اور غداری کے لئے دنیا کے کسی قانون میں عفو اور درگذر نہیں۔ سونپنے کا مقصد یہ ہے کہ ہم اپنی جان کو اس صورت سے فنا کر دیں کہ ہماری جان کسی بڑی جان کا جزو بن کر رہ جائے مگر یہ مرحلہ سننے میں جتنا آسان نظر آ رہا ہے عملی دنیا میں اسی قدر زیادہ سخت ہے۔

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آخر اس فنا کا مقصود کیا ہے۔ اس کا کچھ حاصل تو ہونا چاہیے کیا ہم اہل طریقت کے ہاتھ میں ہاتھ صرف اس لئے دیں کہ مرنے کے بعد چند حوریں اور انگور کے چند باغات ہاتھ لگ جائیں گے؟ یا اسی دنیا میں ہم سے کچھ ایسے کرامات ظہور میں آنے لگیں کہ اہل دنیا ہمیں ایک بہت بڑا صوفی، ایک زبردست رشی سمجھنے پر مجبور ہو جائے؟ اگر اپنی نظر انھیں جزئیات پر ہیں تو غالب اسے نہایت حقارت کی نظر سے دیکھتا ہے۔

دیتے ہیں جنت حیات دہر کے بدلے
نشہ باندازۂ خمار نہیں ہے

بھئی! ہم اس تصور سے باز آئے جہاں اپنی نظر اتنی کوتاہ ہو۔

اپنی ذات جب ذات مطلق میں مدغم ہو جائے۔ رشتۂ عشق جب طالب و مطلوب کے دلوں کو ایک کر دے پھر شاید ہستی مطلق کے ارادے اور اس طالب کے ارادے میں فرق کیا رہ جاتا ہے۔ ان دونوں کی جب ہستی ہو جائے تو پھر نام کے فرق سے کیا ہوتا ہے۔ لوہے کے ایک ٹکڑے کو آگ میں ڈال دو تھوڑی دیر کے بعد دیکھو گے کہ وہ لوہے کا ٹکڑا بھی آگ کا ایک انگارہ بن گیا اب اس کے اندر بھی وہ ساری خصوصیات پیدا ہو گئیں جو آگ کے اندر ہوتی ہیں۔ یعنی اب اس لوہے کو بھی ہم آگ کہنے لگتے ہیں۔ ہاں، آگ کے اور انگاروں میں ہم لوہے کے ٹکڑے کو دور ہی سے پہچان لیں گے کہ یہ لوہے کا ایک ٹکڑا بھی ہے۔ اب اگر آگ کے اندر پڑے ہوئے لوہے کے ٹکڑے کی طرح کسی طالب کی بھی حالت ہو جائے تو ظاہر ہے۔ ہماری ظاہری نگاہیں اس طالب کی ایک الگ شخصیت تو ضرور دیکھیں گی۔ مگر اس انگارے کو نہیں دیکھ سکتیں جو اس کی ذات پر محیط ہے۔ اپنے محبوب کی ہستی میں فنا ہو جانے والی ہستی کی حالت بعینہٖ یہی ہوتی ہے جو متذکرہ بالا مثال میں اس لوہے کے ٹکڑے کی تھی۔ اب اس فنا ہونے والی ہستی کی نظروں میں یہ کائنات کیا اور کائنات کی دلچسپیاں کیا؟ فنا کی اس حد تک پہنچ جانے والا انسان اگر عصا کو سانپ بنا دے دو روٹیوں سے پانچ سو آدمیوں کو شکم سیر کھلا دے یا ایک پیالے دودھ کو بچاسوں دوستوں کو بھر پیٹ پلا دے تو کوئی تعجب نہیں۔ کسی کے کہنے پر کنکریوں نے اگر کلمۂ شہادت پڑھ لیا تو اس میں حیرت کی کون سی بات ہے۔ غالب کا منشا ہے ہم اپنی ذات کو اگر فنا کریں تو اسی حد تک جہاں طالب و مطلوب کے درمیان کا پردہ چاک چاک نظر آئے۔ جہاں ہماری نگاہیں خود محبوب کے رُخِ زیبا پر عالم مستی میں بکھر جائیں کس معنی خیز انداز میں غالب نے اس کی طرف اشارہ کیا ہے۔ ؎

نظارے نے بھی کام کیا واں نقاب کا　　مستی سے ہر نگہ تیرے رُخ پہ بکھر گئی

اور اسی فنا کو حاصل کرنے کیلئے غالب کے مرغ تخیل نے عرش اعظم تک کا پرواز کیا اور پھر جس نکتے کو اس نے حاصل کیا اسے شاعری کی زبان دیکر ہر خاص و عام کیلئے وقف کر دیا۔ کہ تمہارے جینے کا مقصود یہ ہے۔ تمہاری موت کی غرض یہ ہے، تمہاری عبادتوں، تمہاری قربانیوں کا اگر منشا ہے تو یہ ہے ؎

فنا کو سونپ اگر مشتاق ہے اپنی حقیقت کا
فروغ طالع خاشاک ہے موقوف گلخن پر

خس و خاشاک گلخن میں جا کر فنا تو ہو جاتے ہیں۔ مگر کبھی تم نے سوچا کہ فنا ہو کر وہ آخر ہوئے کیا؟ اگر اس مسئلے کو تم نے سمجھ لیا تو ہم غالب کی قسم کھا کر کہتے ہیں کہ تم نے فنا کے مطلب کو سمجھ لیا۔ اور اگر تمہارے ذہن میں یہ مطلب آ گیا تو پھر ایمان کی کہنا اور ایمان ہے کیا؟

کیوں کر اس بت سے رکھوں جان عزیز
کیا نہیں ہے مجھے ایمان عزیز

خاشاک اور گلخن کو نظر کے سامنے رکھ لو غالب کا یہ شعر تمہاری سمجھ میں آ جائیگا۔

پوچھے ہے کیا وجود و عدم اہل شوق کا
آپ اپنی آگ کے خس و خاشاک ہو گئے

اس شعر نے ایک نئی بات کہدی۔ غالب نے کہا آپ اپنی آگ کے خس و خاشاک ہو گئے جس آگ میں جلنے کی تعلیم غالب نے پہلے شعر میں دی۔ وہ آگ آخر ہے کہاں؟ غالب کہتا ہے یہ آگ اپنی ہے یعنی اس آگ کو ہم کوئی خارجی آگ نہیں کہہ سکتے۔ یہ آگ ہمارے دل کے اندر ہی پوشیدہ رہتی ہے۔ ہاں اس آگ کو ابھارنے کیلئے ایک مہمیز، ایک ٹھوکر اور ایک

ضرب شدید کی ضرورت ہے۔ پتھر میں آگ پنہاں ہے۔ اس پر لوہے کی ایک ضرب لگاؤ چنگاریاں پھوٹ پڑیں گی۔ اور ایک مرتبہ اگر چنگاری نکل پڑی تو پھر اس آگ کا تھمنا محال ہے ؎

رگِ سنگ سے ٹپکتا وہ لہو کہ پھر نہ تھمتا
جسے غم سمجھ رہے ہو وہ اگر شرار ہوتا

اور اس آگ کو اصطلاح فنا میں کیا کہتے ہیں؟ شیفتہ نے ذرا مبہم انداز میں کہا ہے ؎

شاید اسی کا نام محبت ہے شیفتہ
اک آگ سی ہے سینے کے اندر لگی ہوئی

اگر یہ آگ خود اپنے دل کے اندر ہی چھپی ہوئی ہے تو پھر اسے لگانے کا سوال پیدا نہیں ہو سکتا۔ لگ جانے کی بات کہی جا سکتی ہے۔ غالب نے صاف صاف لفظوں میں کہہ دیا ؎

عشق پر زور نہیں ہے یہ وہ آتش غالب
کہ لگائے نہ لگے اور بجھائے نہ بنے

لیکن جیسا کہ ابھی ہم نے اوپر کہا کہ جو آگ دل کے اندر پوشیدہ ہے وہ خود بخود پھوٹ تو نہ پڑیگی۔ پتھر پر جبتک چوٹ نہ دیجائے اس وقت تک چنگاریاں نہیں نکل سکتیں۔ دل کے اندر آگ کے شعلے لہرا رہے ہیں ان کیلئے بھی ایک مہمیز کی ضرورت ہے۔ بسا اوقات یہ کام دنیا ہی کی کوئی شئے انجام دیتی ہے۔ اور یہ شعلہ نار چند منازل گذرنے کے بعد آپ ہی آپ نور بنجاتے ہیں۔ مجاز خود بخود حقیقت کا روپ دھارن کر لیتا ہے۔ مگر دنیا میں خدا کی کچھ ایسی مقبول ہستیاں بھی ہیں جن کے سامنے دنیا ہزار دلفریب عنوان اور لاکھ رعنائیوں کیساتھ ہی کیوں نہ آئے۔ ان کی نگاہ غلط انداز بھی اسکی طرف نہیں اٹھتی۔ یہ ہستیاں وہ ہوتی ہیں جو ہوش سنبھالتے ہی مجاز اور حقیقت کے فرق کو سمجھ لیتی ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں

جو دنیا کی حسین سے حسین شے کیطرف دیکھنا بھی (چہ جائے کہ محبت کرنا) شرک سے کم نہیں سمجھتے۔
معاذاللہ گناہ اور ان پاک ہستیوں سے سرزد ہو۔ ان کے پہلو میں ایک دل ہوتا اور وہ نذر ہے اپنے محبوب کی۔
اور ہمارے ناظرین ہمیں کہہ لینے دیجئے یہ غالب جس کا محبوب شغل میکشی کے سوا اور کچھ نہ تھا وہ بھی گنتی
کے انھیں چند ہستیوں کے زمرے میں سے۔ اس نے ایک مضراب کی تمنا کی، ایک ایسی ہستی ایک
ایسی شخصیت کی تمنا کی جسے عام زبان میں رہبر اور صوفیوں کی زبان میں سالک کہتے ہیں کیونکہ
بغیر اسکے اور کوئی چارہ نہ تھا۔ یہ ہستی اگر نہ ہو تو پھر اسکے دل پر ضرب کون لگائیگا۔ ہاں کوئی صاحب
یہ نہ سمجھ لیں کہ یہ وجود فی نفسہ اپنے اندر محبوبیت کا بھی کمال رکھتا ہے۔ بلکہ اس کا کام صرف رہبری
ہے۔ اس کا مقصد صرف دبی ہوئی آگ کو بھڑکا دینا ہے۔ غالب نے ایک ایسی ہی شخصیت
کی تمنا کی قربان جائے اس تمنا اور خواہش کے کتنے شیریں لفظوں اور کیسی پیاری زبان میں یہ تمنا ہے

ڈھونڈھے ہے اس مغنی آتش نفس کو جی
جس کی صدا ہو جلوۂ برق فنا مجھے

اس شعر میں جس مغنی کی تلاش ہے اسکی تعریف غالب نے آتش نفس کی ہے کیونکہ جو مغنی اس صفت سے متصف
نہ ہوگا اسکی صدا برق فنا کا جلوہ نہیں بن سکتی اور جب منزل مقصود ہی فنا ہے تو لازم ہے غالب کا رہبر
کوئی آتش نفس ہی ہوگا اور ہم کہدیں .... غالب نے اپنا رہبر پا لیا تھا۔ جس رہنما کی اسے تلاش
تھی وہ مل چکا تھا اسے۔ البتہ کسی انسان کی صورت میں نہیں بلکہ .... ہاں اس شعر کو پڑھکر
ذرا اسکر لیجئے۔ بشرطیکہ آپ کو ہماری جانب سے کوئی بدگمانی نہ ہو ؎

شرح ہنگامہ ہستی ہے زہے موسم گل
رہبر قطرہ بدریا ہے خوشا موج شراب

فنا کے متعلق ویدانت نے بڑی اچھی شرح کی ہے۔ اس نے اس پر جو روشنی ڈالی ہے اگر اس کی روشنی کا سہارا ہم لیں تو غالب کی فنا کسی قدر سمجھ میں آسکتی ہے۔ ویدانت نے تین اصطلاحیں دی ہیں جو بالترتیب داسو اہنگ (दासो अहं) سو اہنگ (सो अहं) اور اہنگ (अहं) ہیں۔ داسو اہنگ کے معنی ہیں۔ ہم اس کے غلام ہیں جب تک ہمارے ذہن میں عبد و معبود کا تصور ہوگا۔ ہم فنا کی منزل کو نہیں پا سکتے۔ ہمیں کچھ ایسی دشوار گھاٹیوں سے گذرنا پڑیگا جہاں سے گذر جانے کے بعد داسو اہنگ کا دا، خود بخود زائل ہو جائیگا۔ اس وقت ہمارا دل پکار اٹھے گا سو اہنگ (सो अहं) یعنی ہم وہی ہیں جو وہ ہے۔ مگر ابھی بھی فنا نصیب نہ ہوئی۔ یہ ہم ہی تو وہ چٹان ہے جو ہمارے اس کے درمیان حائل ہے۔ اس چٹان کو جب تک ہم اپنے نالۂ خارا شگاف سے پاش پاش نہ کردیں ہمارا محبوب ہمارے سامنے نہیں آسکتا اور جب ہم نے تہیہ کر لیا ہے تو ہمیں جس طرح بھی ہو خواہ اس راہ میں ہزاروں کٹھنائیاں اور مشکلات کا سامنا ہی کیوں نہ کرنا پڑے قدم تو پیچھے کرنا نہیں۔ اور اس "ہم" کو اپنے وجود میں باقی رکھتے ہوئے اپنے محبوب کے وصال کی تمنا کرنا عین بزدلی اور انتہائی درجے کا نفاق ہے۔ اسی سے تو غالب نے کہا ہے ؎

ہر چند سبک دست ہوئے بت شکنی میں
ہم ہیں تو ابھی راہ میں ہے سنگ گراں اور

لیکن جب یہ سنگ گراں پاش پاش ہو جاتا ہے تو پھر وہ جمال دل فراز پردے میں منہ چھپائے کیوں۔ اسے بے نقاب آنا ہی ہوگا۔ اور اس کے دیدار کا عین مقصد ہے کہ ہماری ذات اس کی ذات میں مدغم ہو گئی۔ اس چٹان کے چھپ ہوتے ہی سو اہنگ کا 'سو' خود بخود مٹ جاتا ہے یعنی صرف اہنگ رہ جاتا ہے یعنی اب ہم ہی ہم ہیں۔ اس منزل پر پہنچ کر شیدائی فنا غالب کی زبان میں بول اٹھتا ہے۔

دل میں ذوقِ وصل و یادِ یار تک باقی نہیں
آگ اس گھر میں لگی ایسی کہ جو تھا جل گیا

منصور یہیں پہنچکر انا الحق بول اٹھا تھا۔ غالب یہیں آکر دل ہر قطرہ ہے ساز انا البحر کی گتھی حل کی تھی۔ یہاں پہنچ لینے کے بعد طالب کو پتہ چلتا ہے کہ افوہ آج تک ہم کسی وہم میں گرفتار تھے۔ جسکی تلاش نے ایسی ایسی تکلیفیں دیں۔ جسکے عشق نے نہ جانے کون کون سی منزلوں سے دو چار کیا وہ کچھ بھی اگر ہے تو ایک وحدت، ایک مبنیٔ مطلق اور اسکے ماسوا ساری چیزیں ایک وہم۔ لیکن اقرار باللسان اور اقرار بالقلب میں بہت فرق ہوتا ہے اقرار بالقلب عین مشاہدے کا طلبگار ہے۔ منطق اور فلسفہ اس گتھی کو سلجھا نہیں سکتے۔ اس مسئلہ کو حل کرنے کے لئے مسلسل جدوجہد، پیہم تگ و دو کیضرورت ہے۔ آہ کو چاہیئے اک عمر اثر ہونے تک۔ اور یہی وجہ ہوئی کہ چلنے والے بہت چلے مگر منزل مقصود تک پہنچے چند ہی مخصوص آدمی اور وہ بھی جن کی ذات گرامی کو محبوب حقیقی نے ازل ہی میں منتخب کر لیا تھا۔ قربان جائیے ان مقدس اور پاک ہستیوں کے۔

غالب نے اپنی تلاش کب سے جاری کی؟ یہ ایک سوال ہے جس کا جواب شیدایان غالب مختلف پیرایے میں دیتے ہیں۔ مگر ابھی ہم نے اوپر کہا کہ اگر وقت کا تعین ہم کرتے ہیں تو اس کے یہ معنی ہوئے کہ گویا دل میں آگ دبی ہی نہ تھی۔ محبت ازلی ہے۔ محبت ابدی۔ اس میں کسی خاص وقت کے تعین کا کیا سوال۔ ہاں زیادہ سے زیادہ یہی کہا جا سکتا ہے کہ جو آگ دل میں چھپی ہوئی تھی اس کا ظہور کب سے ہوا۔ حضرت مسیح علیہ السلام نے کہا محبت ہی خدا ہے تو پھر ظہور کا مطلب بجز اس کے اور کیا ہے کہ ہمیں اس کا احساس کس وقت ہوا۔ یہی احساس آگے چلکر مختلف نام بدلتے کے بعد فنا کے رتبے تک پہنچ جاتا ہے۔ اس لئے کہ آگ جب لگ چکی تو پھر بجھائے نہ بنے،

غالب نے راہ محبت انتخاب کی اور ایک مخصوص ڈگر پر چل نکلا۔ اس نے ان لوگوں کی راہ چھوڑ دی جس پر چلکر غالب سے پہلے بھی بہت سے حضرات منزل مقصود تک پہنچ چکے تھے۔ اس کی خود دار طبیعت نے اسے گوارا نہ کیا کہ روندی ہوئی راہ پر اپنے قدم بھی ڈالدیں۔ غالب نے طبیعت ہی کچھ ایسی پائی تھی کہ اس کی ہر بات نرالی۔ اس کا ہر فعل انوکھا جسے دوسروں نے پسند کیا غالب نے اس کی تحقیر کی۔ جسے اوروں نے ناپسند کیا وہ غالب کو مرغوب۔ منزل فنا تک پہنچنے کیلئے غالب نے جو راہ اختیار کی وہ راہ انہیں کے اچھوتی تھی ؎

دل گذرگاہ خیال مے و ساغر ہی سہی
گر نفس جادۂ سر منزل تقویٰ نہ ہوا

شراب یعنی یہی شراب جو وہسکی برانڈی وغیرہ ناموں سے یاد کیجاتی ہے۔ اس میں ہزار برائیاں سہی مگر ایک فائدہ تو ضرور ہے کہ دماغ کے اندر جتنے نفسیاتی خانے موجود ہیں ان سب خانوں کے درمیانی پردے موج شراب کی زد میں آکر اپنی جگہ سے سرک جاتے ہیں اور پھر بادہ خوار کی نظروں کے سامنے وہ وہ مناظر آنے لگتے ہیں جنھیں کسی باہوش انسان کی دماغی نظریں زنہار نہیں دیکھ سکتیں۔ ہاں...... مگر ؎

توفیق باندازۂ ہمت ہے ازل سے
آنکھوں میں ہے وہ قطرہ کہ گوہر نہ ہوا تھا

غالب جیسے انسان کے لیے کوئی دوسری راہ قطعی موزوں نہ تھی۔ موزوں کیا ہوگی وہ راہیں اس قابل ہی نہ تھیں کہ غالب ان کی طرف نظر اٹھا کر بھی دیکھتا خود کہتا ہے ؎

غرض کیجے جوہر اندیشہ کی گرمی کہاں   کچھ خیال آیا تھا وحشت کا کہ صحرا جل گیا

اس شعر میں جوہر اندیشہ کی گرمی وہی گرمی ہے جس کا ذکر اوپر سے ہوتا چلا آرہا ہے۔ غالب کو منزل نظر آچکی تھی۔ راستہ مل گیا تھا۔ ایک رہبر کی تلاش تھی وہ بھی حاصل ہو گیا تھا۔ اب ایسا شخص فنا فی العشق باالفاظ دگر فنا فی اللہ نہ ہو جائے غیر ممکن۔

غالب اپنی فنا تعلیمی کے متعلق ایک مبہم سا اشارہ خود کرتا ہے۔ اس نے اپنی اس تعلیم کے متعلق ایک اجمالی روشنی ڈالی ہے۔ اس سے یہ پتہ چلتا ہے کہ غالب کب سے فنا کی راہ میں گامزن ہے۔ شعر ہے:

فنا تعلیم درس بیخودی ہوں اس زمانہ سے

کہ مجنوں لام الف لکھتا تھا دیوار دبستاں پہ

جنون ایک خاص کیفیت کا نام ہے مجنوں اُسے کہتے ہیں جس پر جنون کی کیفیت گذر رہی ہے۔ جنون یہ وہ جنون نہیں کہ دماغ کا کوئی اسکرو ڈھیلا ہو اور وہ مجنون ہو گیا۔ بلکہ اہل تصوف یا شعرائے کرام جب لفظ جنون استعمال کرتے ہیں تو ان کا مقصد اس جنون سے ہوتا ہے جس میں ایک صادق، ایک دائمی تڑپ، پیہم تپش ہو، مجنوں کی نظر میں اپنے محبوب کے سوا اور کوئی شے آتی ہی نہیں۔ وہ جس طرف بھی اپنی نگاہ اٹھاتا ہے ادھر ہی اس کے مطلوب کے جلوے برق پاشیاں کرتے نظر آتے ہیں حتیٰ کہ وہ ہر چیز کو اپنا محبوب سمجھ بیٹھتا ہے۔ کثرت استعمال نے لفظ مجنوں کو اسم معرفہ بنا ڈالا اور اب جب کبھی جہاں بھی اور جس طریقے سے بھی یہ لفظ آیا کہ ہمارا ذہن فوراً قیس عامری کی طرف منتقل ہو جاتا ہے۔ اس شعر میں مجنوں کا لفظ لا کر غالب نے قیس کی وہ تصویر کھینچ دی۔ جب اس پر محبت کی ساری جنون انگیز کیفیتیں گذر رہی تھیں۔ اور یہ کیفیت عشق کا کمال نہیں تو عروج ضرور ہے۔ غالب کہتا ہے میں درس بیخودی میں اس زمانے سے فنا کی تعلیم حاصل کر چکا ہوں، جب کہ میاں قیس باوجود مجنوں ہو بن جانے کے ابھی صرف دیواروں پر یعنی مکتب عشق کے دیواروں پر جہاں تہاں

صرف لام الف ہی لکھا کرتے تھے۔ یعنی ابھی وہ صرف لا کی مشق ہی کر رہے تھے۔ اور میں اس منزل سے گزر چکا تھا...... بھلا کیوں نہ ہو قیس کے عشق اور غالب کے عشق میں زمین آسمان کا فرق ہے، مگر ظرف ظرف میں فرق ہوتا ہے۔ قیس کے ظرف اور غالب کے ظرف میں بہت فرق تھا۔ دونوں آتش عشق میں جل رہے ہیں۔ مگر قیس ہے کہ اس کے سارے بدن سے شعلے نکل رہے ہیں اور ساری دنیا دیکھتی ہے غالب ہے کہ اس کے جوہر اندیشہ کی گرمی سے صحرا جل جاتا ہے۔ مگر کسی کو خبر تک نہیں ہوتی کہ وہ بھی کسی آگ میں جل رہا ہے۔ منصور نے انا الحق کہکر شاہد مطلق کے ایک راز سربستہ کا افشا کر دیا۔ غالب نے ع دل ہر قطرہ ہے ساز انا البحر کہکر دو گھونٹ شراب اور چڑھائی ایک نشہ کی تاب نہ لا کر کا دوسرا ع

ہوں شراب اگر خم بھی دیکھ لوں دو چار
یہ شیشہ و قدح و کوزہ و سبو کیا ہے

کہکر اپنی عالی ظرفی کے ثبوت دیتا رہ گیا۔ کتنا فرق ہے دونوں میں۔ محبت کے یہ معنی نہیں کہ ہم اپنے محبوب کے رازہی کو آشکار کر دیں۔ یہ اگر تنگ ظرفی نہیں تو تنگ نظری ضرور ہے۔ غالب کا دل منصور کی طرح تنگ ظرف نہ تھا۔ غالب نے جس راز کو پایا تھا۔ جو گتھی اس نے حل کر لی تھی، جس منزل پر آکر وہ کھڑا ہو چکا تھا کیا اس کے اظہار کے لیے اس کی زبان میں قدرت نہ تھی؟ تھی اور ضرور تھی۔ مگر یہ تو اپنی بے حیائی اور تنگ ظرفی کی بین دلیل ہے۔ غالب نے کیا مزے کی چوٹ لی ہے۔ منصور پر کہتا ہے ع

قطرہ اپنا بھی حقیقت میں ہے دریا لیکن
ہم کو تقلید تنگ ظرفی منصور نہیں

غالب کی وسعت دل ملاحظہ ہو. وسعت دل نہیں اسکی حقیقت بینی کہ اس منزل تک پہنچنے کے لیٔے اس نے کفر و اسلام کی تفریق نہ کی۔ اس کی نگاہ حق شناس نے دیکھا کہ ہر وہ شخص اس منزل تک پہنچ سکتا ہے جس کے دل میں ایک سچی لگن لگ جائے. مگر یہ لگن عارضی نہ ہو. بلکہ دائمی. اگر اس کا طلب صادق ہے اگر اس نے اپنا نام وفاداری کی فہرست میں لکھ دیا اور اُس نے کوئی راہ اختیار کرلی خواہ یہ کوئی راہ ہو. بقول حزیں مقصد توئی از سلوک عالم. تو چاہیٔے کہ وہ مرتے دم تک اس پر سختی سے کاربند رہے اور یہی اصل ایمان ہے۔

وفاداری بشرطِ استواری اصل ایماں ہے
مَرے بتخانے میں تو کعبے میں گاڑو برہمن کو

اور پھر چلتے چلتے وہ منزل آجاتی ہے جہاں طالب و مطلوب کی ذات ایک ہو جاتی ہے. من و تو کا جھگڑا مٹ جاتا ہے. قطرہ دریا میں ملکر دریا ہو جاتا ہے اور اسی کو دوسرے لفظوں میں فنا کہتے ہیں. وہ فنا جو غالب کی منزل مقصود ہے۔

اور پھر

قرآن پاک کی اس آیت **انا للہ و انا الیہ راجعون** کی صداقت اور حقیقت واضح ہو جاتی ہے۔

غالب سرورِ کائنات کے حضور میں

زباں پہ بارِ خدایا یہ کس کا نام آیا
کہ میرے نطق نے بوسے مری زباں کے لیے

تم کہتے ہو پروانے شمع پر جل جل مرتے ہیں۔ بلبل پھولوں پر جان چھڑکتی ہے۔ طاؤس ساون کی گھنگھور گھٹاؤں کو دیکھ کر مست ہو جاتا ہے۔ چکوری چاند کو دیکھتے ہی بے خود ہو جاتی ہے۔ اور اس کی وجہ تم یہ بتلاتے ہو کہ ان دونوں ہستیوں کے درمیان محبت کارفرما ہے۔ اگر محبت نہ ہوتی تو پھر غیر جنس پر سو جان سے عاشق ہونا کہاں کی عقلمندی ہے۔ یہ کون سی حرکت ہے معشوق کو مطلق علم نہیں اور جان دینے والا تڑپ تڑپ کر اس کے حسنِ دل افروز پر مر جائے یقینی اُسے ہم دماغ کا خلل ہی کہیں گے۔

بلبل کے کاروبار پہ ہیں خندہ ہائے گل
کہتے ہیں جس کو عشق خلل ہے دماغ کا

ہاں عشق دماغ کے خلل ہی کا نام ہے۔ دماغ کا کام سوچنا اور سمجھنا ہے۔ سوچنا اور سمجھنا یعنی دوسرے لفظوں میں جب تک عقل کی رہنمائی میں دماغ رہتا ہے۔ عشق اس کی ذات سے کوسوں دور ہے۔ عقل کسی گتھی کو سلجھانا چاہتی ہے۔ اور وہ گتھی روز بروز لمحہ بہ لمحہ پیچدار ہوتی ہی جاتی ہے لیکن جب عشق دماغ پر غالب آتا ہے تو وہی گتھی چشم زدن میں سلجھ کر رہ جاتی ہے۔ خدا کے وجود

کا اقرار عقل کی رہنمائی میں ناممکن ہے۔ عشق کو پیشوا بناؤ تو خدا ذرّے ذرّے میں نظر آنے لگے۔ اب اس حرکت کو صاحب عقل دماغ کا خلل کہیں تو بجا۔ اسے ذہنی فتور سے منسوب کریں تو درست مگر ایک دنیا ہے کہ اس دماغی خلل کی گرویدہ ایک عالم ہے کہ اس ذہنی فتور کا شیدا ہے

بے خطر کود پڑا آتش نمرود میں عشق ۔۔۔ عقل ہے محو تماشائے لب بام ابھی ۔۔۔ اقبال

بلبل کے کاروبار کو تم بھلے دماغ کا خلل کہہ سکتے ہو، تمہیں حق ہے کہ پروانوں کی جاں سپاری کو ذہن کا فتور کہہ ڈالو۔ مگر ان دلوں میں جو تڑپ، جو وارفتگی پنہاں ہے۔ انھیں تمہاری آنکھیں نہیں دیکھ سکتیں تو پھر اس قسم کے بے معنی فتاوے صادر کرنے سے مطلب؟ کیا اسے ہم تمہاری کم بینی سے تعبیر نہیں کر سکتے؟ منزل مقصود تک عقل نہیں پہنچ سکتی تمہارے دل کے اندر منزل تک پہنچنے کی خواہش جنون کی حد تک ہونی چاہیے۔ یہ جنون ہے جو تمہیں منزل تک لے جا سکتی ہے ۔

جنوں پا گیا منزل کامرانی ۔۔۔ خرد رہ گئی حوصلے آزما کر (محشر علمی)

وجود کائنات بھی کسی کے عشق ہی کا مظہر ہے۔ حرکت عالم بھی کسی کی محبت ہی کا پرتو ہے۔ مگر سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اس کائنات میں کوئی ایسی ہستی ہونی چاہیے جس سے بانیٔ کونین کو بے پایاں محبت ہو۔ جس وقت کونین کا یہ گھروندا نہ تھا، جس وقت کچھ تھا ہی نہیں۔ نہ زماں نہ مکاں اس وقت بھی وہ ہستی جسے ہم بانیٔ کونین، خالق دو عالم کہتے ہیں، تھی تو پھر آخر کون سی ایسی خواہش اس ہستی کے دل میں پیدا ہوئی۔ وہ کون سی امنگ تھی جس نے اس ہستی کے ارادے کو متحرک کر ڈالا، وہ کون سی تڑپ تھی جو اس کے دل میں پیدا ہوئی۔ اور یہ عالم وجود میں آ گیا؟ اس ہستی مطلق کے ذہن میں ایک من موہنی تصویر آئی تو ہو گی، ایک بھولی بھالی شکل، ایک نورانی پیکر کا تصور

اس کے دل میں آیا ہوگا جسے بقید جسم دیکھنے کی تمنا ذات واحد کے دل میں موجیں مارنے لگی ہوگی. ہاں اس سوال کا جواب خود حدیث قدسی نے دیا ہے. خداوند قدوس اپنے محبوب کو مخاطب کر کے فرماتے ہیں ـــ لولاک لما خلقت الافلاک

اب حضرت غالب اسے دماغ کا خلل کہیں یا جناب محشر اعظمی جنون ـــ مگر ذات باری کی منزل یہی تھی. یہی محبوب رب العالمین، رحمت العالمین بن کر آیا. جس کے آنے کی شہادت آدمؑ سے لیکر عیسیٰؑ تک ہر نبی نے دی

ہوئی پہلوئے آمنہ سے ہویدا دعائے خلیل نوید مسیحا

وہی جو وجود کائنات کا باعث ہو، وہ ذات جس کے تصور نے خدا کے ارادے میں ہلچل ڈالی ہو، وہ محبوب جو خود ممدوح خدا ہو اس کی مدحت میں قلم اٹھانا اور اسکی تعریف میں زبان کھولنا. نسان کے بس کی بات نہیں. ہاں ہم اپنے کام کا آغاز اس کے تصور سے کر سکتے ہیں، اپنے کلام کی ابتدا، اس کے سمرن سے کر سکتے ہیں. اس محبوب کی ذات اقدس پر جتنا غور کروگے تمہاری عقل اتنی ہی قاصر نظر آئے گی. تم اس کی تعریف کرنا چاہو گے اور تمہارے پاس الفاظ نہ ہونگے. تم اس کا سراپا کھینچو گے اور تمہارا قلم دم بخود رہ جائیگا زیادہ سے زیادہ تمہارا تصور پرواز کریگا تو بس تم یہ کہہ کر خاموش ہو جاؤ گے کہ

بعد از خدا بزرگ توئی قصہ مختصر

مگر اتنا کہہ دینا اس کی مدحت اور تعریف نہ ہوئی بلکہ تمہارے تخیل کا عجز ہوا.

شعرائے کرام نے اپنا ایک شعار بنا لیا ہے کہ اپنے دیوان کے شروع میں حمد و نعت ضرور لکھیں گے. مگر ان کی حمد اور نعت کو بغور پڑھو تو ایسا معلوم ہوگا کہ ایک بچہ جسکی ابھی ابھی زبان کھلی ہو.

ایٹم بم اور ہائڈروجن بم کے انکشافات پر تقریر کر رہا ہے۔ ایسا لفظ وہ استعمال کر رہا ہے جس کے معنی اس کے ذہن میں اب تک آئے ہی نہیں۔ اس تقریر سے حاصل؟ جس لفظ کا مفہوم تم خود نہیں جانتے، اسے بولتے کیوں ہو، جس کی ذات کی حقیقت سے نہیں واقفیت ہی نہیں اس کے متعلق اپنی رائے دیتے کیوں ہو؟ کیا پتے کی بات غالب کہہ گیا ہے

کس سے ہو سکتی ہے مداحی ممدوح خدا — کس سے ہو سکتی ہے آرائش فردوس بریں

غالب نے جہاں ہر چیز میں اپنی شاہراہ الگ نکالی ہے۔ اس معاملے میں بھی وہ اور اور شعراء سے ممتاز نظر آتا ہے۔ اس کا دیوان اُلٹ کر دیکھو۔ یہاں بھی اس کی انفرادیت نمایاں طور پر تمہیں معلوم ہو گی۔ اس نے حمد اور نعت کے عنوان سے کوئی نظم یا غزل نہیں لکھی۔ وہ ایک خاص فلسفے کا حامی ہے اس کی شاعری اسی فلسفے کے محور پر گھوم رہی ہے جس نظریے کا وہ علمبردار ہے۔ اس کا ہر شعر اسی نظریے کی طرف اشارہ کر رہا ہے جس شعر کو پڑھو ایسا معلوم ہو گا عرشِ اعظم پر کوئی اس شعر کو گنگنا رہا تھا اور غالب نے وہاں سے اچک لیا، لکھا غالب کے قلم نے مگر لکھ گیا کوئی اور ہی۔ انسان تو انسان فرشتے بھی اس کے شعر کو سمجھنے سے قاصر۔ ہاں "حضرت جبرئیل" کو ذرا مستثنیٰ کر دو۔ کیونکہ یہ وہ فرشتہ ہے جو عرشِ اعظم کے گرد اکثر چکر لگایا کرتا ہے۔ یا شاید کچھ کچھ سمجھ لیتا ہے اور غالب کے کلام کی داد دیتا ہے

پاتا ہوں اس سے داد کچھ اپنے کلام کی — روح القدس اگرچہ مرا ہم زباں نہیں

کیا یہ مبالغہ ہو گیا؟ ہش...... ایسا وہم بھی اپنے دل کے اندر نہ لاؤ شاید تم سے شرکِ خفی سرزد ہو جائے گا

غالب کا مذہبی عقیدہ جو بھی ہو مذہب کے بارے میں اس کے نظریے جو بھی ہوں، اس سے ہمیں بحث نہیں مگر تھا وہ خدا کے رسول، اسی سردارِ کائنات سے والہانہ محبت تھی، رسولِ اعظم کے متعلق اس نے

کا عقیدہ تھا کہ ان کی تخلیق میں وہ اجزا نہیں جو انسانی تخلیق میں ہوتے ہیں، وہ پیکر ان عناصر سے مرکب نہیں جو دوسرے پیکروں میں نظر آتے ہیں۔ بلکہ وہ خاص خدا کا نور تھا جو انسانی پیکر میں ڈھل گیا۔ رب جمیل کو ایک محبوب کی تلاش تھی، خداوند پاک نے جس حسین مکھڑے کو اپنے تصور میں دیکھ لیا تھا جس نازک اندام کی تخئیل اس کے ذہن میں آچکی تھی، اب ضرورت تھی کہ وہ من موہنی مورت اس کے سامنے انسانی پیکر میں آکر ذرا مسکرائے، دو باتیں کرے۔ ذرا دیکھیں تو سہی اس کے بول میں کیا مدھر تا ہے۔ اس کی سبک خرامیوں میں کون سی قیامت چھپی ہے۔ اس لئے اس کے ناز کے انداز میں کون سی لطافت ہے......یقیناً بانی کونین کے دل میں اپنے محبوب کے دیدار کی تمنا جوش مار اٹھی ہوگی۔ یہاں دیر کس بات کی تھی ارادے میں جنبش ہوئی اور کائنات وجود میں آگئی۔ سائنس داں حضرات اور دل دادگان مادہ کونین کی تخلیق کے بارے میں یہ تو کہہ سکتے ہیں کہ یہ زمین و آسمان بن کیسے گئے۔ مگر ان کے ذہن قاصر ہیں اس بات کے کہنے سے کہ یہ بنے آخر کیوں؟

حدیث نے اس راز کا انکشاف کیا۔ غالب نے سر تسلیم خم کر دیا۔ مگر جو ذات اقدس نور ہی نور ہو اس کے لئے ضروری ہے کہ اس کا محبوب بھی اگرچہ قالب انسانی میں ہو مگر ہو وہ بھی نور ہی کا۔ آخر نور کل نے اپنے نور کا ایک سانچہ تیار کیا اور پھر خوش نصیب آمنہ نے اس سانچے کو اپنی گود میں لے لیا۔ غالب کہتا ہے، اے میرے محبوب! اے میرے آقا تیرا وجود وہ وجود ہے جس پر ذات باری فخر کرتا ہے۔ اور یہی شکل اسے منظور تھی جس شکل میں تو جلوہ گر ہوا۔

۵۔ منظور تھی یہ شکل تجلی کو نور کی — قسمت کھلی ترے قد و رخ سے ظہور کی

ہے کوئی تمام عالم میں ایسا شاعر جو اس شعر کے جواب میں ایک شعر بھی پیش کر دے حضرت سعدی

صرف یہ کہہ کر خاموش ہو گئے کہ بعد از خدا بزرگ توئی قصہ مختصر۔ مگر یہ مصرع حضور پُر نور کی مدح نہیں بلکہ شاعر کا اظہار عجز ہے۔ مگر جو شعر غالب نے پیش کیا اگر اس شعر پر غور کرو تو تمہیں آفرینش، راز آفرینش اور باعث آفرینش غرض آفرینش کے متعلق اور تخلیق سے متعلق تمام سوالوں کے جواب ایک شعر میں نظر آئیں گے اور پھر اس شعر کی زبان انداز بیان، غرض ایک ایک لفظ محبت کی شیرینی لیے ہوئے پریم کے رس میں ڈوبا ہوا نظر آ رہا ہے۔ معلوم ہوتا شاعر نے اس نور مجسم کو دیکھ لیا ہے جبھی اس کی زبان سے ایسے بول نکلے ہیں۔ اس نے ذات واحد کے محبوب کا جمال دل افروز دیکھ لیا ہے ورنہ تجلی کو نور کی یہ شکل منظور تھی ہرگز اس کی زبان سے نہ نکلتا۔ جو شخص نابینا ہے اُسے کیا معلوم کہ چودھویں کے چاند، گلاب کے پھول، شفق کی لالی، صبح بہاراں، غرض کائنات کے ذرے ذرے میں کون سا حُسن پنہاں اور کون سا جمال آشکارا ہے۔ جس نے کسی کو دیکھا نہیں وہ اس ذات کی ہیئت کے متعلق کیا خامہ فرسائی کر سکتا ہے۔ تخیل لاکھ پرواز کرے حقیقت کو نہیں پا سکتا۔ صرف ذہن کسی کی تصویر نہیں کھینچ سکتا۔ مصوری کے لیے مطلوب (model) کا سامنا ہونا ضروری ہے۔ اگر غالب نے اس شاہد دل نواز کو اپنی آنکھوں سے نہیں دیکھا تو پھر اس نے ایسا شعر کیوں کہہ دیا۔ تم کہو گے شعرائے کرام تصور میں عرش کے تارے توڑ لاتے ہیں۔ ہم کہیں گے وہ شاعری وقتی انبساط کی وجہ تو ہو سکتی ہے مگر اسے حیات دوام نہیں مل سکتی۔ کلام کی بلاغت اور چیز ہے اور مبالغہ اور چیز۔ فصاحت اور بلاغت کسی شاعر کا طرۂ امتیاز ہو سکتا ہے۔ مگر مبالغہ آرائی ایک شاعر کو کذاب کا خطاب دے بیٹھتی ہے۔ اور یہ جو شعر ہم نے پیش کیا ہے۔ اسے پڑھو اور ایک مرتبہ غور سے پڑھو، دیکھو اس میں بلاغت اور فصاحت دونوں ہے مگر مبالغہ کا نام نہیں۔ شعر کیا ہے انکشاف حقیقت۔ اور یہ اس حقیقت کا انکشاف

ہے جسے حق کہتے ہیں۔ نور قید زماں و مکاں سے پاک ہے۔ مگر جب اس نے بقید زماں و مکاں اپنی تجلی دکھلائی تو وہ آپ کی ذاتِ گرامی بن گیا صلعم۔ کیا نہیں اس شعر میں یہ نظر نہیں آتا کہ اسی ایک شعر نے روحانی اور جسمانی معراج کی گتھی حل کر دی۔ آپس میں تو تو میں میں کرنے والے ملا ذرا اس شعر کو غور سے پڑھیں۔ کیا ان کی بے معنی دلیلوں کو یہ شعر قطع کرتا ہوا نہیں نکل جاتا؟ اے غالب! تیری میکشی کے صدقے۔ کاش تیری شراب کے چند قطرے، ارے نہیں تلچھٹ ہی اس ننگ کونین راقم الحروف کو نصیب ہو جاتی......

اے بہشت تو مذہبی ٹھیکیداروں کے انتظار میں ہے۔ غالب تیری پروا نہیں کرتا وہ اپنی ٹھوکروں سے ایسی بہشتیں تیار کر سکتا ہے۔ اے حوران بہشت تم بن سنور کر، سج دھج کر متقیوں اور پرہیزگاروں کے انتظار میں بیٹھی ہو، غالب تمہاری زہد شکن انگڑائیوں کی طرف نظر اٹھا کر بھی نہیں دیکھتا، یہ وہ شہید ناز ہے جس پر خود تمہاری نگاہیں پڑ رہی ہیں۔ غالب کسی کے غمزہ جاں ستاں کا کشتہ ہے۔ وہ کسی کی زلف گرہ گیر کا اسیر ہے اس کا محبوب وہ ہے جو اس ساری کائنات کا باعث ہے۔ یہ وہ ذات مقدس ہے جس کے حسن کا والہ و شیدا خود حسن آفریں ہے۔ یہ اس کی شمشیر نگہ کا گھائل ہے۔ اپنے محبوب کو مخاطب کر کے کس انداز استغنا سے کہتا ہے ؎

اک خونچکاں کفن میں کروڑوں بناؤ ہیں پڑتی ہے آنکھ تیرے شہیدوں پہ حور کی

اس شعر کا مشار علیہ وہی وجود گرامی ہے جسے غالب نے اپنے مطلع میں مخاطب کیا۔

غالب کو جب اس بات کا یقین ہے کہ تیرے شہیدوں پر خود حوروں کی آنکھیں پڑتی ہیں۔ تو پھر اسے غم کس بات کا۔ دنیا کے رنج و محن بیشمار ہوں، ہوا کریں، غم گیتی ایک نہیں ہزاروں ہوں اس سے غالب کو کیا۔ اس نے تو ساقی کوثر کی غلامی میں اپنا نام لکھا لیا ہے۔ بھلا آقا

کو اپنے غلاموں کی فکر نہ ہوگی. ارے یہ آقا تو وہی ہے جو سارے عالموں کے لئے رحمت بن کر
آیا جس کا خطاب رحمۃ اللعالمین ہے اسے اپنے غلاموں کی فکر نہ ہوگی؟ تو اے واعظ اور اے
ملّا. پڑے رہ جاؤ۔ غالب کی بزم خاص میں جانے کی کوشش نہ کرو، وہ شرابی ہے، وہ شراب
پیتا ہے. تمہاری نظر میں وہ کھلا گنہگار ہے. تمہیں کیا پڑی ہے کہ اس کی مجلس میں جا کر اس
کے رنگین تخیل کو درہم برہم اور اس کی پُر کیف زندگی میں خلل اندازی کرو. دنیا کے رنج والم
کی اُسے پروا نہیں. اس نے دنیا کی طرف نظر اٹھا کر نہ دیکھی، وہ دنیا کو اپنے پاؤں تلے
روند ڈالنا چاہتا ہے اور اس کام میں وہ حق بجانب ہے. دنیا کی مصیبتیں اس کے پاس
گئیں اور اس نے ان سب کو شراب کی پیالی میں ڈبو ڈالا ؎

بہت سہی غمِ گیتی شراب کم کیا ہے
غلامِ ساقیٔ کوثر ہوں مجھ کو غم کیا ہے

اپنے محبوب آقا پر اسے کس قدر یقین ہے. اس بات کا مطلق غم نہیں کہ اس جہانِ خالی سے
رخصت ہونے کے بعد اس پر کیا کیا کیفیتیں گذریں گی. اسے اس بات کا یقین کامل ہے
کہ جب میں ساقیٔ کوثر کا غلام ہوں تو پھر مجھے اور کس بات کا غم ہے؟ غالب سچ کہہ دیا تو نے
تیرے ایمان کے صدقے.

اور غالب کی یہ اُمید ـــــ امید نہیں اس کا یقین بے سروپا نہیں. اسے اچھی طرح معلوم
تھا کہ اس کا کوئی کام بند نہیں رہ سکتا. اس کی کوئی تمنّا ناتمام. اس کی کوئی آرزو تشنۂ کام
نہیں رہ سکتی. کیوں؟ اس لئے کہ اسے اپنے بادشاہ پر یقین تھا. یہ وہ بادشاہ تھا جس کی انگلی
کے اشاروں پر کائنات ناچتی ہے. یہ وہ محبوب دل آرا ہے جس کے چشم ابرو کے اشارے پر
کونین کا ذرّہ ذرّہ جھوم اٹھتا ہے جس کی تمنّا خالق کی تمنّا جس کی گفتار مالک دو جہاں کی

باتیں جن کا منشا خود خدا کا منشا ہے۔ یہ وہ دُرِ یتیم ہے جس کا ثانی نہیں جو ہر دو کائنات کا جو شہنشاہ کونین ہے۔ ہزاروں رسول اور نبی آئے، سینکڑوں منی اور رشی نے تو اس جہانِ فانی کو نوازا مگر آپ ہی کی ذات پاک تھی جو عین حیات میں عرشِ معلیٰ کی سیر کو گئی۔ یہ وہ ہستی ہے جس کی قدم بوسی کے لئے عالمِ لاہوت پریشان تھا جس نے اس جگہ کی سیاحت کی جہاں جبرئیل امین تک کی رسائی نہ تھی۔

عالمِ روحانی کی سیر کے لئے پہلے ایک انسان کو مادے کی قید سے آزاد ہونا پڑیگا اور یہ آزادی اس وقت تک نصیب نہیں ہو سکتی جب تک اس گنبدِ بے در کو موت اپنے خارا شگاف تیشے سے چور نہ کر ڈالے۔ ہاں اس عالم کی سیر صرف آپ اور آپ کی ذات ہی نے کی۔ بھلا ایسے بادشاہ کی اُمت میں پیدا ہو کر غالب کو اس بات کی فکر ہو سکتی ہے کہ اس کا کوئی کام رکا رہیگا۔ ہرگز نہیں ؎

اس کی اُمت میں ہوں میں میرے رہیں کیوں کام بند　　واسطے جس شہ کے غالب گنبدِ بے در کھلا

گنبد بے در سے تم یہ نہ سمجھنا کہ آسمان جو تمہیں نظر آ رہا ہے وہی مراد ہے۔ اس آسمان کی حقیقت جو بھی ہو مگر ہے تو وہ مادی ہی شے۔ سائنس داں کہتے ہیں کہ آسمان حد نظر کا نام ہے تو پھر حد نظر بھی کہیں محدود ہو سکتی ہے۔ تم لاکھوں کروڑوں میل اوپر چلے جاؤ مگر پھر بھی تمہاری نظر اتنے ہی فاصلے پر رکے گی جہاں تک اس دنیا میں کھڑے ہو کر تم دیکھتے ہو اور نظر رک جاتی ہے۔ تو پھر یہ تو سلسلہ لامتناہی ٹھہرا۔ ہاں گنبد بے در سے مراد وہ پردہ ہے جو موت اور حیات کے درمیان حائل ہے۔ یہ پردہ جس بادشاہ کیلئے کھل جائے۔ اسکی امت کو بھلا کس چیز کی پرواہ اور اس کا کونسا کام بند ہو سکتا ہے۔ ہاں غالب نے گناہ کیا اور ڈنکے کی چوٹ کیا۔ مگر اس کا گناہ کیا تھا یہی نا کہ اس نے شراب پی جب

چھپا کر نہیں بلکہ بالاعلان۔ مگر تمہیں کیا پڑی ہے کہ اس کی نجی زندگی میں چہ میگوئیاں کرو۔ اس کی پرائیوٹ لائف (Private Life) سے تمہیں کیا غرض؟ اس نے گناہ کیا تو گناہ کا اعتراف بھی کیا۔ اور اس اعتراف ہی کو وہ ذریعۂ نجات سمجھتا ہے۔ اس لئے کہ اس کا محبوب سراپا رحمت ہے۔ رحمت پناہی کردہ بھیجا گیا ہے

رحمت اگر قبول کرے کیا بعید ہے
شرمندگی ہے عذر نہ کرنا گناہ کا

اپنے محبوب آقا کی رحمت پہ بے انتہا یقین ہے۔ یقین نے ایمان کا جامہ پہن لیا ہے۔

شراب کی بھی دو قسمیں ہیں۔ ایک تو وہی جو خوبصورت بوتلوں اور مینا و خُم میں بند رہتی ہے اور ایک وہ شراب ہے جس کی تعریف خود غالب نے بایں الفاظ کی ہے

ہر چند ہو مشاہدۂ حق کی گفتگو
بنتی نہیں ہے بادہ و ساغر کہے بغیر

کون کہہ سکتا ہے کہ ان دونوں شرابوں میں کون سی شراب کس کی محرک ہے۔ کیا یہ دنیاوی شراب شاید حق بینی میں ممد و معاون نہیں بن سکتی؟ غالب جیسا عالی ظرف اور صحیح الدماغ انسان کبھی یہ گوارہ کر سکتا تھا کہ دنیا کی شراب محض اس لئے پی جائے کہ کیف و سرور حاصل ہو۔ نہیں ہرگز نہیں بلکہ اس پینے سے اس کا منشا تو بجز اس کے اور کچھ نہ تھا کہ اس پر یک گونہ بیخودی طاری رہے جب تک انسان بیخود نہیں ہوتا اس کی خودی اس کے ساتھ لگی رہتی ہے۔ اور جب تک خودی ہے وہ اپنے محبوب کے جمال کو نہیں دیکھ سکتا؟ محبوب کو حاصل کرنے کے لئے سب سے پہلے اپنے آپ سے رشتہ منقطع کرنا ہوگا۔ اگر تم نے اپنی خودی ترک کر دی تو سمجھو ساری کائنات جھنجھوڑ سے کھا کر ایک جھٹکے کے ساتھ دور جا پڑی اور پھر ایسے وقت میں صرف تم ہو اور تمہارا محبوب۔ دشمن اعظم جو شیطان بلکہ ہم لوگوں کے ساتھ لگا ہوا ہے وہ خودی نہیں تو اور کیا ہے

وارستگی بہانۂ بیگانگی نہیں — اپنے سے کر نہ غیر سے وحشت ہی کیوں نہ ہو

اگر یہی حقیقت ہے تو افضل ترین عبادت اپنی خودی کو مٹا کر بیخود ہو جانا ہے۔ اب اگر شراب اس مصرف کے لئے سب سے مفید شئے کسی کے لئے ہے تو یہ شراب بیشک اس شخص کے لئے ذریعۂ نجات ہے۔ غالب اس شراب کے ذریعہ مشاہدۂ حق میں محو ہو جاتا تھا اور اس مشاہدۂ حق کی طرف اس کے ذہن کو کسی مقدس ہستی نے مبذول کیا ہے تو وہ ساقی کوثر کی ذات گرامی ہے۔ تم اگر غالب کو شراب پینے نہیں دیتے تو اس کا صاف مطلب ہے کہ تمہیں ساقیٔ کوثر سے بدگمانی ہے (نعوذ باللہ)۔ ہاں تخیل کی بلند پروازی تو دیکھنا۔ اپنے دعویٰ کی دلیل کو کہاں سے کہاں جا ملایا ہے۔ ذرا انداز بیان ملاحظہ ہو

کل کے لئے کر آج نہ خست شراب میں — یہ سوء ظن ہے ساقیٔ کوثر کے باب میں

کل سے مراد فردائے قیامت ہے۔ کہتے ہیں بہشت میں جا کر ہر بہشتی اللہ تعالیٰ کا جمال دیکھے گا۔ کوثر ایک حوض ہے جہاں ساقی گری خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سپرد ہوگی۔ بمقصد واضح ہے کہ حضورؐ کے طفیل ہی بہشتی خدا کے دیدار سے شرف یاب ہونگے۔ تو کیا یہ شرف بہشت میں جانے کے بعد ہی حاصل ہو سکتا ہے۔ غالب کہتا ہے اگر تمہارا یہی عقیدہ ہے تو گویا ساقی کوثر کے باب میں تمہیں سوء ظن ہے العیاذ باللہ۔ ایک وہ انسان جو اپنے کو ساقی کوثر کا غلام کہے اسے ہرگز ایسا عقیدہ رکھنا نہ چاہیئے۔

غالب کو اسی سرور کائنات کی غلامی پر فخر تھا۔ اس غلامی کو ہی وہ اپنا سب کچھ سمجھتا تھا۔ اور اسی آقا کی مہربانیاں تھیں کہ اس نے جمال حق کو بارہا بے نقاب دیکھ لیا ورنہ غالب اور اسکی زبان سے یہ شعر نکلے

کیا فرض ہے کہ سب کو ملے ایک سا جواب — آؤ نہ ہم بھی سیر کریں کوہِ طور کی

کوہ طور کی سیر سے غالب کا جو مقصد تھا وہ مقصد یقینی پورا ہو چکا تھا۔ اس نے بے خودی کے عالم میں اپنے

محبوب کو دیکھ لیا۔ اس کے دل میں سرور پیدا ہوا اور تصور نے اسے ہفت آسمان کی سیر کرا دی جب گتھی کو سلجھانے کے لئے برسوں کی ریاضت اور مراقبے کی ضرورت ہے۔ غالب کے دل نے وہ گتھی منٹوں میں سلجھائی تھی ورنہ کیا فرض ہے کہ سب کو ملے ایک سا جواب۔ غالب کے قلم سے نہ نکلتا۔ حضرت کلیم کی ساری عظمتیں برحق مگر غالب جب شاہد مطلق کا کشتۂ ناز تھا اس کی رفعتوں کو .... نہیں آہ[1] نہ لکھوں گا۔ ورنہ کوئی ملا میری گردن دبوچ لے گا۔ اگر میں لکھوں تو حضرت کلیم کی شان اقدس میں کچھ گستاخی ہو جاتی ہے۔ ہاں دبی زبان اتنا تو ضرور عرض کر دوں گا کہ قانون سازسے قانون شکنی کی اجازت ایک قانون داں کو نہ مانگنی چاہیئے۔ قانون شکنی جرم ہے مگر ایک دیوانے کے لئے.........؟

کیا فرماتے ہیں علمائے کرام بیچ اس مسئلے کے۔

قانون شکنی کر کے اگر تم سزا سے بچنا چاہتے ہو تو پہلے تمہیں پاگل بننا ہوگا۔ ارے مخشر ہم تیرے اس شعر کے قربان ؎

جنوں پا گیا منزل کامرانی　　خرد رہ گئی حوصلے آزما کر

اے ہوشمندو! اے عقل کے پجاریو! ذرا الگ ہٹ جاؤ۔ کہیں غالب تمہیں دیکھ نہ لے۔ یہ شرابی۔ یہ بے خبر انسان...... نہیں نہیں کونین کی آگہی جس پر قربان، اپنے محبوب سے راز و نیاز کی باتیں کرتے کرتے شکوہ شکایت پر اتر آیا۔ سرور کائنات جن کے پائے مبارک کا بوسہ آسمان نے لیا، جن کے قدموں پر مہر و ماہ نے اپنی آنکھیں بچھا دیں، ان کے حضور غالب اپنے دل کے جذبات پیش کر رہا ہے۔ شور نہ مچاؤ، خلل نہ کرو غالب بڑا ہی نازک طبیعت انسان ہے بہو

---

[1] :۔ میں نے اپنے ہر مضمون میں جمع متکلم "ہم" لکھا ہے۔ مگر بعض جگہ ضرورتاً اور قصداً "میں" بھی استعمال کیا ہے۔

وہ کیا کہہ رہا ہے۔ مگر اس کہنے میں بھی اپنی انفرادیت کو ہاتھ سے جانے نہیں دیتا۔

کس واسطے عزیز نہیں جانتے مجھے
لعل و زمرد و زر و گوہر نہیں ہوں میں

رکھتے ہو تم قدم میری آنکھوں سے کیوں دریغ
رتبے میں مہر و ماہ سے کمتر نہیں ہوں میں

کرتے ہو مجھ کو منع قدم بوس کس لیے
کیا آسمان کے بھی برابر نہیں ہوں میں

چند گھنٹے غالب کے ساتھ

لال قلعہ میں بزم مشاعرہ منعقد تھی۔ آخری تاجدار مغلیہ حضرت بہادر شاہ ظفر بنفس نفیس خود صدارت کے فرائض انجام دے رہے تھے۔ مومن خاں اور شیفتہ اپنی نازک خیالیوں اور رنگین بیانیوں سے ساری مجلس کو اپنا دیوانہ بنا چکے تھے۔ استاد شاہ محمد ابراہیم ذوق کے سامنے شمع آ چکی تھی۔ ٹھیک اُسی وقت کسی نے خبر دی۔ دبیر الملک نجم الدولہ مرزا نوشہ کی پالکی دروازے پر لگی ہے اور وہ باریابی کی اجازت چاہتے ہیں۔ جناب ذوق اٹھ کھڑے ہوئے مومن اور شیفتہ دروازے کی طرف بڑھے۔ ساری مجلس میں خوشی کی لہر دوڑ گئی۔ بہادر شاہ ظفر کا چہرہ کھل اٹھا کسی بد باطن نے بادشاہ سے یہ چغلی کھائی تھی کہ حضرت غالب لال قلعہ کے مشاعرے میں شریک ہونا اپنی توہین سمجھتے ہیں۔ ظفر کو حضرت غالب کی ذات گرامی سے ایسی توقع نہ تھی۔ اس خبر پر یقین کرنے کے لئے ان کا دل ہرگز آمادہ نہ تھا۔ مگر اتنی دیر تک حضرت غالب کا مشاعرے میں نہ آنا شک و شبہ سے خالی بھی نہ تھا۔ ان کی طبیعت کچھ افسردہ سی ہو رہی تھی۔ مشاعرہ پھیکا پھیکا معلوم ہو رہا تھا۔ شعرائے کرام کی غزل خوانیاں، موسم بہار کی رنگینیاں، چاندنی رات کی تمام سحر طرازیاں ظفر کو بے کیف محسوس ہو رہی تھیں صرف اس لئے کہ آج کا مشاعرہ اس فلسفی شاعر کے وجود سے خالی تھا۔ جو کائنات کی گتھی سلجھانے ہی کے لئے دنیا میں تشریف لایا تھا۔ جس کا ہر شعر فلسفہ حیات کا حامل، جس کی ہر

بات خالق و مخلوق کے راز و نیاز کی عقیدہ کشا یہ وہ شاعر تھا جس نے قطرے میں سمندر اور اپنی ذات میں خود بائی کونین کو دیکھا تھا جس نے ذرے پر نگاہ کی تو اس میں خورشید کو جلوہ گر پایا۔ جس نے حسن کا خالق محبت اور محبت کا خالق خود اپنی ذات کو سمجھا تھا۔ شعرائے کرام اپنی غزل خوانیوں میں سرمست تھے اور بہادر شاہ کی زبان گنگنا رہی تھی۔

از مہر تا بہ ذرہ دل و دل ہے آئینہ
طوطی کو شش جہت سے مقابل ہے آئینہ

بہادر شاہ کی مایوس نگاہیں بار بار مجمع کی طرف اٹھتی تھیں اور ہر بار ناکام واپس آجاتی تھیں۔ اقلیم ہند کا بادشاہ شہنشاہ اقلیم سخن کا متلاشی تھا۔ پورس اور سکندر کے مکالمے اس کے ذہن میں محفوظ تھے۔ بادشاہ ہی ایک بادشاہ کی قدر کر سکتا ہے ہاں اس انحطاط پذیر عہد میں حضرت مومن، ذوق بھی دو نفوس ایسے تھے جو صوفی صد نہیں مگر پھر بھی کسی حد تک حضرت غالب سے ضرور واقف تھے۔ مومن خاں ایک حکیم اور نجومی تھا۔ جناب ذوق ایک ملا تھے۔ مگر پھر بھی ان دونوں کی باطن بین نگاہیں غالب جیسے رند کو پہچان رہی تھیں۔ یہ شرابی اپنی ہستی شراب کی نذر کر چکا تھا جو ایک دن بھی شراب کے بغیر نہیں رہ سکتا جس کا اوڑھنا بچھونا شراب جس کی معشوقہ شراب اور شراب جس کی زندگی، اس دور کے نام نہاد مسلمان کیا سمجھنے لگے کہ غالب کو شراب کے ساغروں میں کونسی دنیا نظر آتی ہے۔

شراب نوشی اور شراب کے مضامین ا[illegible]ں میں باندھنا دو الگ الگ چیزیں ہیں۔ یہ کوئی ضروری نہیں کہ جو شراب نہیں پیتا اس کے مضامین شراب سے بالکل مبرا ہوں گے اور اسی طرح یہ بھی کوئی ضرور نہیں کہ وہ شاعر جو دن رات لال پری ہی کی صحبت میں وقت گزارتا

ہو اس کے کلام میں شراب کے مضمون ضروری ہوں گے۔ جس شاعر کے کلام میں شراب کے مضامین زیادہ پائے جاتے ہیں عام طور پر لوگوں کا یہ گمان ہوتا ہے کہ وہ شاعر شراب وکباب کا بڑا رسیا ہوگا۔ اور شراب پی پی کر ایسی ایسی غزلیں اور رباعیاں لکھتا ہوگا۔ مگر جب تحقیقات کی جاتی ہیں تو بسا اوقات وہ شاعر جن کا مضمون ہی شراب ہے انھیں ملّا صفت اور کٹر پابند صوم وصلوٰۃ پاکر یک گونہ حیرت ہوتی ہے کہ یا خدا ہم کیا سمجھ رہے تھے اور وہ نکلے کیا۔

حافظ کا دیوان اٹھائیے پہلی ہی غزل کا پہلا شعر ہے۔

الا یا ایہا الساقی ادر کاسا و ناولہا

کہ عشق آساں نمود اوّل ولے افتاد مشکلہا

اور پھر آپ حضرت حافظ کا پورا دیوان دیکھ جائیے۔ شراب اور شراب۔ شراب اور لوازمات شراب ان کے کلام سے دھوکا کھا کر ہی ایک مدت تک یورپ انھیں بھی رند بلانوش سمجھ رہا تھا۔ مگر جدید تحقیقات سے پتہ چلا ہے کہ یہ حافظ شراب نوشی تو در کنار زندگی بھر اس نے شراب دیکھی ہی نہیں تو اہل یورپ انگشت بدنداں رہ گئے۔ اور پھر ان کے اشعار کی تفسیروں کا رُخ ویدانت، تصوّف، اور روحانیت کی طرف موڑ دیا گیا۔ خیام کے متعلق بھی یہی بدگمانی تھی (اور اب تک جرمن اور انگلینڈ کے بعض کلبوں میں ہے کہ خیام بھی ایک نے پرد مست میکش تھا۔ شرح جاری ہے۔ تحقیقیں ہو رہی ہیں اور ایک دن وہ آئیگا کہ محقق اپنے بیانات شائع کریں گے کہ خیام نے مطلق شراب پی ہی نہیں۔

مگر اب حسن ظن غالبؔ کی ذات سے ہم نہیں رہ سکتے۔ غالبؔ وہ شاعر نہیں جس کے واقعات زندگی افسانوں میں گم ہیں۔ خود ان کے خطوط شاہد ہیں، ان کے شاگرد رشید جناب الطاف

حسین حالی کی کتاب یادگار غالب ہی شہادت دے رہی ہے کہ غالب نے شراب پر صرف شعر ہی نہیں کہے بلکہ وہ شراب کے نشے میں ہمہ وقت چور بھی رہتے تھے۔ اور جس دن انھیں شراب نہ ملی اس دن ان کی حالت غیر ہوگئی۔ ایک خط میں رقمطراز ہیں "سردی بلا کی پڑ رہی ہے۔ ہاتھ پاؤں ٹھٹھر رہے ہیں۔ سامنے انگیٹھی رکھی ہوئی ہے۔ دو لفظ لکھتا ہوں اور پھر آگ پر ہاتھ تاپ لیتا ہوں۔ مگر اس آگ میں وہ گرمی کہاں جو آتش سیال میں ہے اِدھر دو گھونٹ پی نہیں کہ سارے بدن میں گرمی دوڑ گئی ...."

غالب نے شراب پی اور ضرور پی مگر اس شراب نوشی سے ان کا مقصد بجز یک گونہ بیخودی کے اور کچھ نہ تھا ایک جگہ انھوں نے صاف صاف کہہ دیا ہے ؎

مے سے غرض نشاط ہے کس روسیاہ کو
یک گونہ بیخودی مجھے دن رات چاہیئے

یہ اس شراب کا ذکر ہے جو خوشنما بوتلوں میں بند ہو ہو کر شیراز اور فرانس سے آتی تھی۔ جس شراب کو حضرت غالب کے دولتکدے تک پہنچا دینا غالب کے شاگرد اپنی نیک بختی اور سعادت مندی کی دلیل سمجھتے تھے۔ مگر ایک اور شراب تھی جسے خیام و حافظ بھی پی چکے تھے۔ یہ وہ شراب تھی جس کی ایک گھونٹ پیتے ہی منصور جیسا خرد مند انسان بھی دیوانہ وار چیخ اٹھا اور نشہ اس حد تک پہنچ چکا تھا کہ اِدھر تن سے سر جدا ہو رہا ہے اور اُدھر زبان ہنوز اسی شراب کی مدح سرائی کر رہی ہے۔ مگر وہی جیسا کہ خود حضرت غالب فرما چکے ہیں ؎

دیتے ہیں بادہ ظرفِ قدح خوار دیکھ کر ـــــ منصور کے ظرف سے زیادہ شراب ساقی ستم ظریف کے اس ساغر میں انڈیل دی۔ منصور تاب نہ لا سکا۔ غالب نے کس مزے

کا طنز اور کس شیریں لہجے میں ایک جگہ کہا ہے۔

قطرہ اپنا بھی حقیقت میں ہے دریا لیکن
ہم کو تقلید تنک ظرفیٔ منصور نہیں

جب اس شعر کو فضاؤں کی لہریں عالم برزخ کی طرف لے اڑی ہوں گی نہ جانے اس وقت جناب منصور کی روح نے کون سی لذت محسوس کی ہوگی۔ ابتک ہمارا گمان تھا کہ شاید منصور کے دل کو دکھ پہنچا ہوگا مگر اب جو ذرا غور سے اس شعر کو پڑھتے ہیں تو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ منصور کی رُوح اس شعر کو سن کر عالم برزخ میں رقص کر رہی ہوگی۔ منصور پر یہ عقدہ تو کھل گیا کہ اس نے جس حقیقت کا انکشاف کیا تھا۔ اور جس چیز کا نعرہ بلند کیا تھا اس کی بنا کچھ تو ہم پرستی اور دھوکے پر نہ تھی۔ بلکہ دھوکے میں وہ حضرات تھے جنھوں نے اس کے قتل کا فتویٰ صادر فرمایا تھا۔

غالب نے حقیقت پالی تھی، اس کا محبوب اس کے سامنے بے نقاب آچکا تھا۔ اس نے اس حق (۳۲ تا ۱۳) کو دیکھ لیا تھا جس کی تلاش میں کائنات کا ذرہ ذرہ رواں دواں ہے جس کی صرف ایک جھلک دیکھ لینے کے لئے بڑے بڑے رشیوں اور منیوں نے، حضرت موسیٰ و عیسیٰ جیسے باوقار نبیوں نے اور دنیا کی عظیم ہستیوں نے اپنی تمنا ظاہر کی تھی جسے بھگوان کرشن نے خدا کہا، اس حق کی تہہ کو حضرت غالب کی نگاہ حق بیں نے دیکھ لیا۔ مگر جس کیف و سرور اور لذت پنہاں سے غالب کا دل محظوظ ہو رہا تھا جس خود فراموش رنگین مناظر سے اس کی آنکھیں لذت یاب ہو رہی تھیں، اس کے اظہار کے لئے دنیا کی کسی لغت میں الفاظ نہیں۔ الفاظ چاہئیں۔ اگر الفاظ گھڑے جائیں تو ان سے محظوظ ہونا تو درکنار دنیا والے

اس کے معنی تک سمجھ نہیں سکتے۔ اگر ایک آٹھ نو سال کا لڑکا بھولے پن سے آپ سے یہ دریافت کرے کہ شب عروسی اپنے اندر کون سی رنگینیاں اور لذتیں نہاں رکھتی ہے تو آپ کے لئے یہ غیر ممکن ہو جائیگا کہ اس کے تحقیق پسند دل کو آپ تمثیلوں اور مثالوں سے مطمئن کر دیں۔ غالب کی نظر بالغ، اس کا تخیل بالغ ...... اور ادھر یہ دنیا ...... توبہ توبہ۔ غالب جس جگہ کھڑا تھا وہاں تک پہنچنے کے لئے دنیا کو سینکڑوں سال چاہئیں۔ غالب نے جب دنیا پر نگاہ کی تو اسے ہنسی آ گئی۔ اسے ایسا محسوس ہوا کہ اب تک اہل دنیا گڑیے گڑیوں کا کھیل کھیل رہے ہیں۔ اس گھروندے بنا بنا کر کھیلنے والے کیا غالب کی دقیق نکتہ رسی کی تہہ کو پا سکتے ہیں۔ دنیا اور اہل دنیا پر جب غالب کی نظر گئی۔ غالب کے اندر کا انسان بول اٹھا۔ دنیا دم بخود رہ گئی شعر ہوا میں تھر تھری پیدا کرنے لگے۔ ؎

بازیچۂ اطفال ہے دنیا میرے آگے
ہوتا ہے شب و روز تماشہ میرے آگے
اک کھیل ہے اورنگ سلیماں میرے نزدیک
اک بات ہے اعجاز مسیحا میرے آگے

کیوں غالب کی زبان کو تراش نہ دی جائے۔ کیا ایسے گستاخ کیلئے سر بریدن کا فتویٰ صادر نہیں ہو سکتا؟ مگر ہم نے اپنی پچھلی کسی نشست میں کہا تھا کہ یہ اسد اللہ خاں کے بول نہیں بلکہ غالب کا مدھر بول ہے۔ غالب کو قتل کرنے کے لئے کسی حسین کسی راحت جان ...... صاف لفظوں میں یوں کیوں نہ کہدیں اس سکون دل کو تیغ بکف آنا پڑیگا۔ جواب تک پردے میں ہے جس کے متعلق غالب کہتا ہے۔

ے آرائش جمال سے فارغ نہیں ہنوز
پیش نظر ہے آئینہ دائم نقاب میں

غالب جانتا تھا جس دن اس کا محبوب آرائش جمال سے فارغ ہو گا اسی دن وہ اپنے چہرے سے نقاب لے لے گا۔ اور اس نقاب کا الٹنا ہی قیامت ہے تو پھر ایک غالب کیا کی قید۔ مرگ انبوہ جشنے دارد۔ جس محبوب کے رُخ زیبا کو غالب کی نگاہیں دیکھ چکی تھیں۔ جس حق کے لذت آگیں مشاہدات اس کے بیقرار دل پر ایک کیفیت طاری کر چکے تھے۔ اس کے اظہار کے لیے غالب کہاں سے لفظ لائے۔ اور پھر اس دنیا کے لیے جو اس کی نظروں میں بازیچۂ اطفال سے کچھ زیادہ وقعت نہیں رکھتی۔ ہاں ایک اور صرف ایک لفظ غالب کی بیتاب نظروں نے ڈھونڈھ نکالا۔ غالب گنگنا اٹھا۔ مرغان چمن جھومنے لگے۔ صبح بہاراں مسکرا اٹھی۔ لالہ و گل تو بہ شکن انگڑائیاں لینے لگے۔

ے ہر چند ہو مشاہدۂ حق کی گفتگو
بنتا نہیں ہے بادہ و ساغر کہے بغیر

ہاں غالب کے بادہ و ساغر کا مفہوم ذہن میں آگیا۔

بہادر شاہ ظفر کی بیقرار آنکھیں دروازے کی طرف گئیں۔ ایک آدمی کا سہارا لیے ہوئے مرزا نوشہ اپنی مخصوص رفتار میں چلے آرہے تھے۔ آنکھیں شراب کے نشہ سے بوجھل ہو رہی تھیں پاؤں کی لغزش پر شیفتہ اور مومن پردہ ڈال رہے تھے۔ ساری مجلس تعظیماً اٹھ کھڑی ہوئی۔ بہادر شاہ ظفر کو غالب کورنش بجا لا کر اپنی جگہ پر آبیٹھے۔ شمع استاد ذوق کے سامنے تھی۔ بادشاہ کی ایما پا کر ذوق نے اپنی غزل چھیڑی۔ مجمع پر ایک کیفیت طاری ہو گئی۔ ذوق نے پڑھا۔

اے شمع صبح ہوتی ہے روتی ہے کس لیے تھوڑی سی رہ گئی ہے اسے بھی گذار دے

غالب کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ ایک ٹیس تھی جو دل میں پیہم اٹھنے لگی۔ مرزا ابیفزا ہو گئے دائیں بائیں مومن اور شیفتہ بیٹھے ہوئے تھے، ذوق کی طرف دیکھکر دونوں کی زبان سے بیساختہ "مکرر ارشاد ہو" نکل پڑا۔ مگر ذوق خاموش رہے۔ انھوں نے غالب کی آنکھوں کو دیکھ لیا تھا۔ اس راز دانِ حیات کی آنکھیں اشک آلود تھیں۔ ذوق نے اپنے شعر کا صلہ پا یا اور غالب نے شاید اپنے درد کی دوا پائی۔

غالب نے کہا شیخ صاحب خاکسار کا بھی ایک شعر اسی مضمون پر ہے۔ مگر جہاں میں نے عقل کو دعوت عقدہ کشائی دی ہے۔ آپنے سیدھا دل ہی پر تیر چلا دیا ہے۔ آپکے شعر میں درد ہے میرے شعر میں مضمون کی باریکی اور اس پر لوگ مجھے شاعر کہتے ہیں۔ آپ کا شعر سن کر جی تو چاہتا ہے میں اپنا شعر پھینکدوں۔ دلی کی سرزمین نے ہمیشہ غالب سے بہتر شاعر پیدا کیا۔ اس دن ایک لڑکا مومن کا شعر گاتا ہوا گذر رہا تھا۔ میں اپنے چند دوستوں کے ساتھ شطرنج کھیلنے میں منہمک تھا کہ ناگہاں آواز کان سے ٹکرائی ؎

تم میرے پاس ہوتے ہو گویا　　جب کوئی دوسرا نہیں ہوتا

مت پوچھیے شیخ صاحب میرے دل پر کیا گذری تھی۔ اس وقت میں نے اپنا سارا دیوان اس شعر کے عوض دے دینا چاہا مگر یہ ظالم نجومی میری بات کب رکھنے والا تھا۔

بادشاہ ظفر نے کہا " مرزا صاحب! کیا ہم لوگ آپکے اس شعر سے لطف اٹھا سکتے ہیں"۔

ذوق بول اٹھے " مرزا! پہلے آپ اس شعر کو سنا لیجئے تب میں آگے بڑھوں"۔

غالب نے پڑھا۔ مجلس ہمہ تن گوش بنکر سننے لگی۔

غمِ ہستی کا اسد کس سے ہو جز مرگ علاج　　شمع ہر رنگ میں جلتی ہے سحر ہونے تک

ذوق کا چہرہ فق ہو گیا۔ انھوں نے اپنے اور غالب کے شعر پر غور کیا۔ ایک دفعہ نہیں متعدد بار۔ انھیں ایسا محسوس ہوا کہ غالب کا شعر آسمان کی سیر کر رہا ہے تو ان کا زمین پر بیٹھا ہوا سسک رہا ہے۔ دونوں کے شعروں میں کوئی تعلق نہیں، کوئی نسبت نہیں۔ بجز اس کے کہ دونوں نے شمع ہی کو دیکھ کر مضمون آفرینی کی ہے۔ لیکن ہائے مرزا تمہیں خدا نے کس گوشت پوست سے بنایا ہے۔ کہ تمہاری نگاہ میں دوسروں کے شعر تمہارے اپنے شعروں سے بہتر نظر آتے ہیں۔ تم فلسفی ضرور ہو مگر تمہارا دل شاعر کا ہے۔ شاعر کا دل بغض و حسد سے پاک جو اپنے آپ کو دنیا کی ہر شئے میں دیکھتا ہو اور دنیا کی ہر چیز جس کے اندر۔ پہنائی افلاک، وسعت کائنات، اور رفعت عرش اعظم جس کے اندر۔ شاعر کا دل پریم کا سرچشمہ محبت کا گہوارہ .... محبت جسے حضرت مسیح نے خدا کہا۔ شاعر خود شناس ہوتا ہے خود بین نہیں ہوتا۔

ہندوستان کے دو بڑے شاعروں نے خودی پر قلم اٹھائے ہیں۔ غالب اور اقبال۔ مگر دونوں نے خودی کو دو الگ زاویہ سے دیکھا۔ اقبال کی خودی یعنی خودداری اور غالب کی خودی یعنی خود بینی ہے۔ ایک نے اپنی خودی کو اتنا بلند کرنا چاہا کہ خود کاتب تقدیر کو قلم روک لینا پڑ جائے۔ دوسرے نے اپنی خودی کو اتنا مٹا دینا چاہا کہ من و تو کا قصہ ہی ختم ہو جائے۔ دونوں کی دو مختلف راہیں ہیں۔ اور اگر منزل پر نگاہ کیجئے تو دونوں کی منزل ایک ہے۔ مگر دونوں کے اندر خود اعتمادی اور وفاداری جزو اعظم ہیں۔

غالب نے کہا جب تک انسان کے اندر 'ہم' موجود ہے وہ اپنی منزل مقصود تک نہیں پہنچ سکتا۔ لہٰذا اگر تم اپنے محبوب کے وصل سے مشرف یاب ہونا چاہتے ہو اگر اس کی زیارت حاصل کرنا چاہتے ہو تو لازم ہے سب سے پہلے اس ہم کے بت کو پاش پاش کر دو۔ یہ ایک بہت

بڑی چٹان ہے جو عاشق اور معشوق کے درمیان حائل ہے۔ ذرا غالب کا اندازِ بیان ملاحظہ ہو، کتنے شیریں لفظوں میں اس قوم کی توجہ اپنی رائے کی طرف مبذول کرتا ہے۔ جو قوم اپنے محبوب کے لئے ساری کائنات کو ہیچ سمجھتی ہے۔ جس نے دنیا کے کل بتوں کو توڑ ڈالا۔ مگر خود اسے اپنے اندر کے بت پہ نگاہ نہ گئی کتنا ہے۔

ہر چند سبک دست ہوئے بت شکنی میں
ہم ہیں تو ابھی راہ میں ہیں سنگِ گراں اور

یہی 'ہم'، سنگِ گراں بن کر محبوب تک پہنچنے نہیں دیتا۔

اس 'ہم' کو توڑنے کے لیے جہاں دنیاوی لوازمات ضروری ہیں وہاں روحانیں طبقہ (spiritual class) کی نظر روحِ اعظم کی طرف بھی بیساختہ اٹھ جاتی ہے۔ غالب نے حضرت آدم کی کہانی کا حوالہ دیکر خداوند کریم سے التجا کی۔ اے رب العزت! اس میں شک نہیں جناب آدم تیری جنت سے بہت ہی ذلیل خوار ہو کر نکلے۔ مگر ہم تو یہ چاہتے ہیں کہ ہمارے اندر جو 'ہم' ہے۔ ان سے بھی زیادہ ذلیل و خوار اور بے آبرو ہو کر تیری گلی سے نکلے۔ اگر یہ 'ہم' تیری گلی سے نکلتا نہیں تو پھر تیرے اور ہمارے درمیان ایک سنگِ گراں تو حائل ہی رہ جاتا ہے۔

ذرا اس مشہور و معروف التجائیہ شعر کو سنیئے اور پھر خدا لگتی کہیئے کہ غالب نے کس پتے کی بات کہدی اور بربط کے کس تار پہ مضراب مارا ہے

نکلنا خلد سے آدم کا سنتے آئے ہیں لیکن
بہت بے آبرو ہو کر ترے کوچے سے ہم نکلے

ناظرین. واضح رہے دوسرے مصرع کا لفظ نکلے، نکلنا کا صیغہ ماضی مطلق نہیں بلکہ نکلن کا مضارع ہے.

اگر نکلے کو آپ نے ماضی کا صیغہ سمجھ رکھا ہے. جب تو یہ شعر ایک مذاق سے بڑھکر زیادہ اہمیت نہیں رکھتا. غالب کے شعروں میں کوئی لفظ بیکار نہیں آتا. اس کا ہر لفظ ایک مخصوص مضمون کی طرف اشارہ کرتا ہے.

اور ہمیں کہہ لینے دیجیے غالب کو تائید غیبی حاصل ہو چکی تھی. اس کے اندر کا ہم فنا ہو چکا تھا. یہی ہم جب فنا ہو جاتا ہے تو ہم اور آپ صوفیائے کرام کی زبان میں کہتے ہیں سالک نے اپنی منزل پالی ہے.

مگر غالب کی خودی کی فنا اقبال والی خودی کی فنا کی دلیل نہیں. غالب کی غیرت کو کون نہیں جانتا. اس کی خودداری کے واقعات سے صفحات بھرے پڑے ہیں. فارسی کی پروفیسری ذرا سی بات پر اس نے چھوڑ دی. خوشامدی اور درباری شعراء کی روش اس نے ترک کر دی. خود غربت اور مفلوک الحالی کی زندگی بسر کی. مگر کسی کے سامنے اس نے دست سوال نہ اٹھایا. بیگم جھنجھلاتی تھیں الگ. احباب جان کھاتے تھے الگ. مگر اس نے اپنی سربلند ہستی کے وقار میں ذرا بھی حرف آنے نہ دیا. جب وہ اسد اللہ خاں ہے اس وقت وہ اسی دنیا کا ایک چلتا پھرتا انسان ہے وہ اپنی نظر میں کسی کو لگاتا ہی نہیں. بادشاہ کی سواری سامنے سے گذر جائے مگر اس کے سر پر غرور میں ذرا بھی حرکت نہیں ہوتی اور پھر وہ غیرت اور خودداری کا پیکر ہو کیوں نہ؟ اس نے کچھ دوسروں کو خوش کرنے کے لیے تو شاعری کی نہیں. اس نے شاعری کی مگر اپنے لیے. اس کا مخاطب صرف اس کا محبوب تھا. اگر اس کی بھی شاعری

رسمی ہوتی تو آج دنیا غالب کو اس قدر کی نگاہوں سے نہ دیکھتی جو آج دیکھ رہی ہے۔
اور یہی اسد اللہ خاں جب غالب کے روپ میں جلوہ گر ہوتا ہے تو پھر اس کی خودی پاش پاش نظر آتی ہے، اس کا جامۂ ہستی تار تار نظر آتا ہے۔

چکبست نے سائنس کا ایک مسئلہ چھیڑا اگر اسے شعر کی زبان دے دی ؎

زندگی کیا ہے عناصر میں ظہور ترتیب
موت کاہے انھیں اجزا کا پریشاں ہونا

ظاہر ہے ہستی مرکب ہے اربعہ عناصر سے۔ مگر اسی اربعہ عناصر کی دھجی غالب کے یہاں یوں اُڑ کر اڑتی ہے۔ یہ اجزا کچھ موت کی وجہ سے پریشان نہیں ہوتے بلکہ عاشق کے طلب صادق نے موت سے پہلے موت کا سا منظر پیش کر دیا۔ ہائے ہائے کیا بلا کی کشش ہے اس شعر میں ؎

حیف اس چار گرہ کپڑے کی قسمت غالب
جس کی قسمت میں ہو عاشق کا گریباں ہونا

ہمارا تو اپنا خیال ہے اس شعر کو سامنے رکھ کر جناب چکبست نے اپنا شعر کہا ہوگا۔
غالب کی آنکھوں میں آنسو دیکھ کر بادشاہ ظفر بیقرار ہو گئے۔ حضرت ذوق کے دل میں بھی ایسی کیفیت پیدا ہونے لگی۔ شعرائے کرام جو غالب کے مزاج اور اکڑ دیکھ چکے تھے اس منظر کی تاب نہ لا سکے مجمع پر سکوت طاری تھا۔ لوگوں کی نظریں کبھی بادشاہ کی طرف اور کبھی غالب کی طرف اٹھ رہی تھیں کچھ دیر کے بعد جب غالب کو سکون ہوا تو ذوق نے جلد از جلد اپنی غزل سنا ڈالی۔ اب صرف بہادر شاہ ظفر اور مرزا غالب رہ گئے مومن خاں چاہتے تھے بادشاہ پہلے اپنی غزل سنائیں اور حضرت ذوق کی خواہش تھی پہلے مرزا غالب ہی اپنی غزل پڑھیں ظفر نے ذوق کے جذبات تاڑ لیے۔ قبل اس کے کہ

غالب اپنی جیب سے کوئی پرزہ نکالیں۔ ظفر نے اپنا مطلع پڑھ دیا غالب خاموش ہوگئے۔

بہادر شاہ ظفر نے جب اپنی غزل سنا ڈالی تو شمع مرزا غالب کے پاس آئی۔ غالب نے اپنی غزل سنا کر شاہ ظفر کو اپنے مقطع کی طرف متوجہ کیا ؎

یہ مسائل تصوف یہ تیرا بیان غالب

تجھے ہم ولی سمجھتے جو نہ بادہ خوار ہوتا

ساری مجلس کلمہ تحسین سے گونج اٹھی۔ بادشاہ کی زبان مرحبا، مرحبا آفریں صد آفریں، بول اٹھی۔ غالب مسکرا رہا تھا۔ مومن اور ذوق جھوم رہے تھے۔ شیفتہ تو پاگل ہی ہوئے جا رہے تھے۔ جب مجمع کچھ شانت ہوا تو بادشاہ عزت پناہ مسکرا کر بول اٹھے۔ مرزا نوشہ: ہم تو ابھی بھی آپ کو وہی سمجھتے ہیں۔ معلوم نہیں دوسروں پر اس جملے نے کیا اثر ڈالا۔ مگر غالب جھینپ گیا۔ اب اسے احساس ہوا کہ آج اس نے ضرورت سے زیادہ شراب پی لی ہے۔

انسان لاکھ کوشش کرے مگر تاڑنے والوں کی نظریں تاڑ ہی جاتی ہیں۔ غالب نے شراب پی کر اپنی ذات اور اپنی حقیقت پر پردہ ڈالنا چاہا تھا جس کے ذرا سے انکشاف نے منصور جیسے حق گو کی گردن اتار لی تھی۔ مگر آج اس شرابی نے درپردہ اپنی حقیقت کا اظہار کر ڈالا۔ نشے کے ترنگ میں آکر اس نے اپنے چہرے سے نقاب اتار ڈالی۔ ظفر کی نگاہوں نے دیکھ لیا، اس کے حقیقت شناس دل نے پہچان لیا کہ یہ غالب جو شراب کے نشے میں مخمور ہے کوئی معمولی انسان نہیں بلکہ یہ سلوک کی ساری دشوار گذار گھاٹیاں اور کٹھن منزلیں طے کرتا ہوا اب اس مقام پر آپہنچا ہے جہاں اسے خود پتہ نہیں کہ وہ کہاں ہے غالب خود کہتا ہے ؎

ہم وہاں ہیں جہاں سے ہم کو بھی   کچھ ہماری خبر نہیں آتی

مشاعرہ دو بجے شب کو ختم ہوا۔ سب نے اپنے اپنے گھر کی راہ لی۔ دروازے تک خود بادشاہ ظفرؔ
اور استاد ذوقؔ مرزا غالبؔ کو پہنچا گئے۔

اپنے ڈیرے جب میاں غالب پہنچے تو یہاں کا نقشہ ہی کچھ اور تھا۔ بیٹھک خانے میں جاکر
انھوں نے پوشاک بدلی۔ شراب کا نشہ اتر چکا تھا۔ اب انھیں بھوک محسوس ہوئی۔ اندر جو
گئے دیکھا سب دروازے بند۔ بیگم کے کمرے کی کنڈی کھٹکھٹائی مگر وہ ضعیفہ بجائے اس کے
کہ اٹھ کر دروازہ کھولتی، بستر پر بیٹھے بیٹھے لگی صلواتیں سنانے۔ کس موئے کے سر لوگوں نے باندھ
دیا ہے کہ نہ دن کو چین نہ رات کو آرام۔ نہ کپڑا میسر نہ کھانا نصیب۔ مدت ہوئی کہ اس مردوے
نے جو میری کبھی خبر لی ہو۔ جب دیکھو کاغذ، جب دیکھو شاعری۔ بھاڑ میں جاؤ تم اور تمھاری شاعری
شہر کے سرپھروں نے تمہارا بھی دماغ خراب کر دیا ہے۔ یہ مشاعرہ کونسی بلا ہے...... کہ نہ گھر
کی فکر نہ میرا خیال بس نگوڑے مشاعرے کے پیچھے دیوانہ ہیں۔ جاؤ میں دروازہ نہیں کھولتی اگر تم
نے ضد کی تو بس پھانسی لٹک کر مر جاؤں گی۔ ہاں۔

دبیر الملک نجم الدولہ مرزا اسد اللہ خاں المتخلص بہ غالبؔ بھیگی بلی کی طرح دبے پاؤں وہاں سے
کھسکے اور بیٹھک خانے میں جاکر اطمینان کی سانس لی۔ چراغ جلایا تو دیکھا کسی دوست کا خط پلنگ
پر پڑا ہوا ہے۔ کھول کر پڑھا تو مزاج پرسی کے بعد دہلی میں جو وبا آئی تھی اس کے متعلق استفسار
کیا ہے۔ غالب نے جھٹ قلم اٹھایا اور وہیں جواب لکھنے بیٹھ گئے۔

"— کیسی وبا اور کیسا پلیگ۔ جو وبا ایک کم ستر برس کی بڈھی کو نہ مار سکی وہ
وبا کیا۔ ایک پھندا ہے جو میرے گلے ڈال دیا گیا ہے نہ گردن ہی کٹتی ہے اور نہ پھندا ہی ٹوٹتا ہے۔"